غالب اور غمگین کے فارسی مکتوبات

اردو ترجمے، فارسی متن
اور
توضیحات کے ساتھ

مترجم و مرتب
پرتو روہیلہ

مقتدرہ قومی زبان، پاکستان

غالب اور غمگینؒ کے
فارسی مکتوبات

ہمارے دور کی ایک انتہائی اہم
علمی و ادبی دریافت

اردو ترجمے، فارسی متن
اور
توضیحات کے ساتھ

مترجم و مرتب
پرتوؔ روہیلہ

محسنان و محبانِ گرامی

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

ڈاکٹر محمد شفیق عجمی

ڈاکٹر سعادت سعید

کے نام

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

پیش لفظ

پرتو روہیلہ ایک خوش نوا شاعر اور خوش وضع شخصیت کا نام ہی نہیں، وہ تحقیق اور خاص طور پر غالبیات کی تحقیق کے حوالے سے ایک مستند حوالہ بن چکے ہیں، انھوں نے غالب کے حوالے سے ان کی ایوانِ فارسی کے کئی نیم وا در یچے روشن کیے ہیں۔ وہ ایک عرصے سے مکتوبات غالب پر تحقیق کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے نہ صرف غالب کے فارسی مکتوبات کا اردو ترجمہ کیا بلکہ نہایت مفصل ضمیمے بھی تیار کیے۔ بارہ برس کی عرق ریزی کے بعد غالب کے تمام متداول فارسی مکتوبات کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ مذکورہ مکتوبات پانچ جلدوں میں دستیاب تھے۔ پرتو روہیلہ کی کتاب کو نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد نے ''کلیات مکتوبات فارسی'' غالب کے عنوان سے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا۔ اسی کام کو جاری رکھتے ہوئے موصوف نے ''غالب کے منتخب فارسی مکتوبات'' کے عنوان سے ۲۰۰۹ء میں ایک کتاب شائع کی اور اب اسی حوالے سے مقتدرہ قومی زبان پرتو روہیلہ کی تازہ کتاب بعنوان ''غالب اور غمگین کے فارسی مکتوبات کا اُردو ترجمہ'' مع حواشی قارئین کی نذر کر رہا ہے۔ ہمیں امید ہے یہ کتاب بھی غالب شناسی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگی۔

مقتدرہ کی جانب سے اس کتاب کی اشاعت پرتو روہیلہ کی خدمات کے لیے سپاس گزاری کا درجہ رکھتی ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد

پیش گفتار

لوگوں میں 'بالعموم' کام سے زیادہ نام کی خواہش ہوتی ہے۔ اور اگر کام کا شوق ہو بھی تو بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دینا ہی روشِ عام ہے۔ بقولِ یگانہ

ع   اپنے بس کا کام کر لیتا ہوں آساں دیکھ کر

مگر ہر زمانے میں جہاں سہل پسندی اور عافیت کوشی کا غلبہ ہوتا ہے وہاں ایک قلیل سی تعداد ایسے دیوانوں کی بھی ہوتی ہے جنہیں مبدءِ فیّاض سے ہمّتِ دشوار پسند عطا ہوئی ہوتی ہے اور جن کا ناخن ہمیشہ عقدۂ مشکل کا طلبگار رہتا ہے۔ ہمارے محترم دوست مختار علی خاں پرتو روہیلہ اِسی مبارک اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں جس کی آبلہ پائی وادیٔ پُر خار میں کانٹوں کی پیاس بجھاتی ہے۔ غالب نے کہا تھا

ے   سخنِ سادہ دلم را نفریبد غالب
نکتۂ چند ز پیچیدہ بیانے بمن آر

ترجمہ:

''غالب! سادہ بات میرے دل کو نہیں لُبھاتی
کسی پیچیدہ بیان کے چند نکتے مجھے لا کر دے۔''

غالب کی پیچیدہ بیانی اور مشکل پسندی حضرت پرتو کے پسندِ خاطر ٹھہری اور انہوں نے گنجینۂ معنی کے اس طلسم کو کھولنے کے لئے اپنے مہ و سال وقف کر دیئے۔ انہوں نے ''مشکلاتِ غالب'' کے عنوان سے غالب کے مشکل اردو اشعار کی شرح بھی لکھی مگر اس سے بہت پہلے، مشفق خواجہ مرحوم کی تحریر پر اُن کا رُخ غالب کے فارسی مکاتیب کی طرف ہو چکا تھا۔

غالب کی فارسی نثر کو سمجھنا اور پھر اُسے خوانا (readable) اُردو نثر میں ڈھالنا مشکل اور محنت طلب کام تھا مگر بقولِ اقبال

ے تیشہ اگر بہ سنگ زد ایں چہ مقامِ گفتگو است
عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

ترجمہ:

''اگر اُس نے تیشے سے پتھر پر ضرب لگائی تو اس میں کیا کلام ہو سکتا ہے
عشق تو اس تمام سلسلہ کوہ کو کاندھے پر ڈھو سکتا ہے۔''

پرتو روہیلہ کے عشق نے انہیں فرہاد کی سی سخت جانی عطا کی اور انہوں نے مغلق فارسی عبارتوں کے بے ستون کاٹ کر اردو والوں کے لئے دودھ کی نہریں بہا دیں۔ ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۵ء تک کے عرصے میں اُن کے قلم سے ''نامہ ہائے فارسی غالبؔ''، ''مآثرِ غالبؔ''، ''آہنگِ پنجم''، ''متفرقاتِ غالبؔ'' اور ''باغ دو در'' کے اردو تراجم منظرِ عام پر آئے جنہیں ۲۰۰۸ء میں کلیاتِ مکتوباتِ فارسیِ غالبؔ'' کے زیرِ عنوان بڑی تقطیع کی ایک ضخیم جلد میں یکجا کر دیا گیا۔ فارسی متن کے اضافے نے اس کام کی افادیت میں اور اضافہ کر دیا۔ ''غالبؔ کے پراگندہ فارسی خطوط'' پر کام اِس کے علاوہ تھا۔

ان تراجم کی انفرادیت محض رواں دواں ہونا ہی نہیں بلکہ یہ ہے کہ مترجم نے فارسی متن کی ساخت اور اسلوبِ اظہار کا ذائقہ اردو میں بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ متن اور ترجمے کے دقیق موازنے سے، ممکن ہے کچھ اختلاف کے پہلو نکل سکتے ہوں تاہم اس سے اِس عملاقی (Gigantic) کام کی اہمیت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ ''یہ ایک پہاڑ جیسا کام تھا جو انہوں نے گیارہ بارہ سال کی مسلسل محنت سے بڑے سلیقے کے ساتھ کر دکھایا۔'' ۲۰۰۹ء میں اس ساری کاوش کا عطر نکال کر جناب پرتو نے ''غالب کے منتخب فارسی مکتوبات'' کی شکل میں پیش کر دیا جس میں فارسی متن کے علاوہ مکتوب الیہم کے حالاتِ زندگی بھی درج کئے گئے ہیں۔

غالبیات کے اس جادۂ دشوار پر چلتے ہوئے اُن کی توجہ غالبؔ اور اُن کے ایک بزرگ ہم عصر میر سید علی خان بہادر غمگین عرف حضرت جی کی باہمی مراسلت پر بھی مبذول ہوئی۔ ''کلیاتِ مکتوباتِ فارسیِ غالب'' میں حضرت جی غمگین کے نام ایک خط مندرج تھا۔ پراگندہ خطوط میں یہ تعداد نو مزید خطوط کے

اضافے سے عشرۂ کاملہ کو پہنچ گئی۔ غالبؔ کے نام غمگینؔ کے چار خطوط شامل ہو جانے کے بعد اُن چودہ مکاتیب کا فارسی متن، پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب کی عنایت سے موصول ہو کر، ابتداءً ڈاکٹر سید عبداللہ اور سید وزیرالحسن عابدی کی مساعی سے اورینٹل کالج میگزین کے شمارۂ فروری ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔

میر سید علی غمگینؔ عمر میں غالبؔ سے کوئی چالیس پینتالیس برس بڑے تھے۔ طویل عمر پائی، جو بالعموم سو برس کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے، چنانچہ میرؔ اور غالبؔ دونوں کی ہم عصری کا شرف اُنہیں حاصل ہوا۔ ایک ذی وجاہت خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ دنیوی جاہ و منصب کے ساتھ ساتھ، جادۂ تصوّف پر گام زن ہونے کے باعث حلقۂ روحانیاں میں بھی نیک نام اور باقاعدہ خرقہ و خلافت کے حامل تھے۔ زہد و عبادت، سیر و شکار، ورزشِ جسمانی اور شاعری سے بیک وقت گہرا شغف تھا اور اس اعتبار سے ایک ہمہ جہت اور یگانۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ شاعری میں اُن کا طبقہ قائمؔ، آثرؔ اور یقینؔ وغیرہ کے ساتھ متعین کیا جاتا ہے۔ عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں مسائل تصوّف کے بھی ترجمان رہے جن کا اظہار اُن کی عارفانہ رباعیات ''مکاشفات الاسرار'' میں ہوتا ہے۔

۱۸۲۷ء سے ۱۸۲۰ء تک کے تین برس میں مرزا غالبؔ اور میر غمگینؔ کے مابین وہ مراسلت ہوئی جو پرتوؔ روہیلہ صاحب کی اس تازہ کاوش کا موضوع ہے۔ اِن خطوط کی دریافت کی طویل کہانی خاصی اُلجھی ہوئی ہے جس کی تفصیل پرتوؔ صاحب کے پیش لفظ ''واحد متکلم'' نیز ڈاکٹر اختر نظمی کے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''میر سید علی غمگین دہلوی...... حیات، شخصیت اور شاعری'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مجھے ان مکتوبات کے مندرجات پر یہاں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ پرتوؔ روہیلہؔ صاحب کی مساعی سے ان کا فارسی متن اور اردو ترجمہ دونوں ہمارے سامنے ہیں۔ مجملاً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطوط غالبیات کے ذخیرے میں ایک اہم اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی تاریخی، ثقافتی، مذہبی، علمی اور ادبی فضا پر قابلِ قدر روشنی ڈالتے ہیں۔

اُس زمانے کے وضع دارانہ اور آرائشی اسلوبِ نگارش کے باعث اس خیال کا اظہار بھی کیا گیا کہ شاید غالبؔ نے غمگینؔ سے اصلاح لی اور یہ کہ غالبؔ، غالباً، اُن کے مرید بھی ہو گئے تھے۔ جناب

پرتوؔ نے بڑی خوبی سے تنقید و تجزیہ کر کے ان دونوں باتوں کی نفی کر دی ہے۔ بلکہ یہ واضح کر دیا ہے کہ غالبؔ کی انا اور آزادہ روی کا نقش خود ان مکاتیب میں یوں واضح دکھائی دیتا ہے کہ اس نوع کے خیالات کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

جناب پرتوؔ نے اپنے مفصل پیش لفظ میں ان مکاتیب کے فارسی متن کی اورنٹل کالج میگزین میں اشاعت کا جو پسِ منظر مہیا کیا ہے وہ کل سولہ خطوط اور ایک مختصر مضمون کے ذکر پر مشتمل ہے۔ جس میں مرزا غالبؔ نے ایک طوفانی آندھی کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ تاہم میگزین کے مُدیر نے اپنے نوٹ میں وضاحت کی ہے کہ اُنہیں جو مسوّدہ عملاً موصول ہوا ہے اُس میں صرف چودہ خطوط ہیں اور آندھی سے متعلق مضمون بھی موصول نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر اختر نظمی نے اپنے مقالے میں غالبؔ و غمگین کے مابین مراسلت کی چند اور نو دریافت کڑیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کے بعد چھ خط حضرت غمگیںؔ کے اور بارہ مرزا غالبؔ کے ملا کر کل اٹھارہ خطوط ہو جاتے ہیں۔

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آندھی پر مذکورہ مضمون اور چند مکاتیب مزید ابھی توجہ طلب ہیں۔ پرتو روہیلہ صاحب جیسے انتھک غالب شناس سے بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ رگِ تاک سے اِس بادۂ ناخوردہ کو بھی کشید کر لیں اور آئندہ اشاعت میں شامل فرما دیں۔

زیر نظر کتاب کے آخر میں لگائے گئے تمام ضمیمے، خصوصاً متصوّفانہ اصطلاحات کا ضمیمہ، معلومات افزا ہیں۔ میں غالبیات کے ضمن میں اس گراں قدر خدمت کا خیر مقدم کرنا اپنے لئے موجبِ اعزاز جانتا ہوں۔

اَللّٰھم زِد فزِد۔

خورشید رضوی

باسمہ

واحد متکلم

غالبؔ پر ہمہ تن توجہ کے سبب جب میں نے غالبؔ کے ان دس خطوط کا اردو ترجمہ کیا جو انہوں نے حضرت سیّد علی غمگین کو لکھے تھے، تو اُس وقت اُن چار خطوط کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا جو حضرت غمگین نے غالبؔ کو لکھے تھے۔ مندرجہ بالا غالبؔ کے دس خطوط کا اردو ترجمہ پاکستان کے مشہور و مقبول سہ ماہی ''سورج'' لاہور کے شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۳ میں چھپا تھا۔ اگر یہ شمارہ کچھ عرصہ قبل میرے سامنے نہ آتا تو شاید مجھے اس کا اندازہ بھی نہ ہوتا کہ ان کی طباعت کو سات سال گزر گئے اور میں غالبؔ کے اس عظیم مکتوب الیہ اور اپنے زمانے کے انتہائی مقبولِ عام صوفی و قبلۂ ہدایت کی طرف بطور بایست توجہ نہ دے سکا، جب کہ اس ناقابل معافی تساہل بلکہ تغافل کے لیے بھی میرے پاس کوئی معقول عذر نہیں۔ آج اپنی اس غلطی کا احساس مجھے اس وجہ سے بھی شدت سے ہو رہا ہے کہ غالبؔ، اور حضرت غمگینؔ کی اس مکاتبت کو جو باہم پیوستہ ہونے کے سبب ایک مکالمے کا حکم رکھتی ہے اور کوئی صاحب ذوق ادب شناس ان خطوط کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتا تاوقتے کہ یہ خطوط ایک ساتھ، ایک وقت میں نہ پڑھے۔ اس خیال نے ایسا مہمیز کیا کہ میں نے یہ سوچا کہ کیوں نہ غالبؔ اور حضرت غمگینؔ کی اس مکاتبت کو یکجا کر کے توضیحات، حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع کر دیا جائے کہ تشنگان ادب کے لیے بالعموم و غالب شناسوں کے لئے بالخصوص طمانیت کا باعث ہو۔ چنانچہ پچھلے چند ماہ سے اسی خواہش کی تکمیل میں کوشاں تھا اور اب کہ بیشتر راستہ طے ہو چکا ہے اور خال و خدِ منزل اجاگر ہونے لگے ہیں، اپنے خیال میں اپنے قارئین سے ہم کلام ہوں اور مکتوبات کی اس کتاب کے لیے دیباچے کا ڈول ڈال رہا ہوں۔

سوائے ایک[1] کے غالبؔ کے یہ سارے خطوط آثارِ غالبؔ میں نئی دریافت ہیں۔ یعنی غالبؔ کے فارسی خطوط

---

[1] ضمیمہ ا ص ۲۲۳ پنج آہنگ۔ تدوین و تصحیح و تحقیق سید وزیر الحسن عابدی۔ مطبوعات مجلس یادگار غالب ۱۹۶۹۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

کے جتنے متداولہ مجموعے ہیں کسی میں دستیاب نہیں۔ اسی طرح غالبؔ کے نام حضرت غمگینؔ کے یہ چار فارسی خطوط بھی غالب کے خطوط ہی کی طرح اہم اور قابل توجہ نئی دریافت ہیں۔ یہ ان خطوط کی سب سے بڑی اور پہلی فضیلت ہے۔ یہ سارے خطوط اپنی جگہ اپنے مضامین و مطالب کے اعتبار سے بھی تشنگانِ ادب کے لیے ایک انمول تحفہ ہیں یہ ان خطوط کی دوسری فضیلت ہے۔ اللہ کا انتہائی کرم ہے کہ ادب نوازوں تک ان کی رسائی آج ایک مجموعے کی صورت میں میرے وسیلے سے ہو رہی ہے۔

یہ خزانہ مجھ تک بلکہ میں اس خزانے تک کس طرح پہنچا! سو اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ ڈاکٹر[۲] سید عبداللہ کی زیر ادارت اورینٹل کالج میگزین میں یہ سارے خطوط طبع ہوئے اور ڈاکٹر مذکور کے بقول ان خطوط کی تصحیح انہوں نے اور سید وزیر الحسن عابدی نے خود کی۔ ڈاکٹر عبداللہ کو ان خطوط کا مسودہ محمد مسعود احمد صاحب ایم۔ اے شعبہ اردو گورنمنٹ کالج میر پور خاص سے ملا تھا۔ بقول ان کے ''بعض جگہ متن بے حد غلط تھا۔ اس کو درست کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ پھر بھی ممکن ہے غلطیاں رہ گئی ہوں۔ جہاں قیاسی تصحیح یا اضافہ کیا گیا ہے وہاں قوسین کا استعمال کیا ہے۔ متن میں جہاں جہاں خلا ہیں ان کو نقطوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔''

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی مختصر مندرجہ بالا تحریر کے بعد اس میگزین میں ان خطوط کے ساتھ ایک پیش لفظ بھی ہے جس پر محرر کا نام اس طرح لکھا ہے۔ ''از شاہ رضا محمد حضرت جی'' اور اس پیش لفظ کی تاریخ تحریر ۱۵ مئی ۱۹۶۱ء تحریر ہے۔

قارئین کے لئے میں اس پیش[۳] لفظ کو کلیتاً نقل کرتا ہوں کہ ان مکتوبات کی دریافت سے براہ راست منسلک ہے۔

''مرزا غالبؔ مرحوم نے جو رقعات حضرت سیّد علی غمگینؔ ناخدائے سخن علیہ رحمۃ کی خدمت بابرکت میں ارسال کیے اور جو رقعات جواب میں تحریر کیے گئے ان سب کو حضرت شاہ غمگینؔ خدا نما

ضمیمہ ۲

ضمیمہ ۳

کے ایک جلیل القدر خلیفہ مولانا حافظ میاں ہدایت النبی قادری گوالیاری مرحوم و مغفور نے جمع کر کے اپنے قلم سے نقل فرمائے ہیں۔ یہ نسخہ کتب خانہ فقیر منزل گوالیار میں جلد نمبر ۱/۳۳ پر موجود ہے۔"

"مذکورہ بالا مجموعہ خطوط ۱۲۵۷ھ میں نقل کیا گیا ہے۔ جب کہ حضرت غمگیںؔ خود حیات تھے۔ اس قلمی مجموعے میں کل سولہ خطوط ہیں اور ایک مختصر مضمون ہے جو مرزا غالبؔ مرحوم نے دہلی کی ایک طوفانی آندھی کا حال بڑے دل چسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس مجموعے میں دس خط وہ ہیں جو مرزا غالبؔ نے شاہ غمگیںؒ علیہ رحمۃ کو بہ حیثیت اپنے پیر و مرشد رقم کیے ہیں اور دو خط وہ ہیں جو انہوں نے اپنے لکھنؤ کے دوستوں کے نام لکھے ہیں۔ لیکن شاہ غمگین کے صرف چار جوابات ہیں جو اسرار و معارف کے نادر رقعے ہیں۔"

"یہ خط و کتابت ۱۲۵۳ھ لغایت ۱۲۵۶ھ جاری رہی ہے۔ مرزا غالبؔ کے تین خطوط میں سنہ بھی تحریر ہیں مگر دیگر چار خطوط میں صرف تاریخ لکھی ہے اور تین خطوط میں نہ تو تاریخ ہے اور نہ سنہ۔ اور حضرت صاحب کے خطوط میں نہ تو تاریخ ہے اور نہ سنہ۔" (تاریخ ۱۵۔ مئی ۱۹۶۱ء)

(نوٹ: از مدیر میگزین اورینٹل کالج لاہور۔ ہمیں جو مسودہ پروفیسر محمد مسعود احمد کی عنایت سے ملا ہے اس میں صرف چودہ خطوط ہیں۔ چار غمگین کے اور دس غالب کے۔ اس کے علاوہ "آندھی سے متعلق مضمون بھی نہیں۔")

اب ان مکتوبات سے پہلے اور شاہ رضا محمد حضرت جی کے منقولہ بالا پیش لفظ کے حقائق کی تصدیق میں ایک دیباچہ[۴] ہے جو فارسی میں ہے اور لکھنے والے کا نام "ہدایت النبی قادری" ہے اور سنہ تحریر ۱۸۴۳ء/۱۲۵۷ھ ہے۔ اس دیباچے کے اس حصے کو نقل کرتا ہوں جو شاہ رضا محمد حضرت جی کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔

...... اما بعد بندۂ سراپا گناہ ہدایت النبی قادری گوالیاری خواست انچہ کہ مرزا نوشہ متخلص بہ غالبؔ متوطن اکبرا باد و حال ساکن جہان آباد کہ در نظم و نثر نظیر خود ندارند چند مراسلات بہ عبارت

ضمیمہ ۴

متن و مضامین نو آئین . . . . اکثر مشتمل بر دقائق تصوف بجناب جامع حقیقت و معرفت.. حضرت میر سیّد علی عرف حضرت جی صاحب دام افضالہم ترسیل داشت و آن جناب جواب باصواب... ارقام فرمودہ اند، جمع نماید بہ دلم آمد و بخاطرم گذشت کہ اگر گل ہائے کہ رنگ و بوئے مطالب و مقاصد صوری و معنوی دارد، گلدستۂ مجموعہ گردد...... بنابرآں ہر یک سوال و جواب را بہ ترتیب ارقام نمود ..... ۱۸۴۳ء/ ۱۲۵۷ھ۔" (ضمیمہ۴: دیباچہ از ہدایت النبی قادری گوالیاری)

غالبؔ اور غمگینؔ کی اس مراسلت پر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا ایک مبسوط مقالہ "غالبؔ کے چند غیر مطبوعہ فارسی مرقعات حضرت غمگینؔ کے نام" کے عنوان سے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے رسالے "اردوئے معلّٰی" کے غالبؔ نمبر ۱۹۶۰ شمارہ نمبر۱ میں چھپا ہے۔ اس مضمون سے جہاں غمگینؔ کے ذاتی اور خاندانی پسِ منظر کے بہت سے گوشے روشن ہوتے ہیں ان خطوط کی دریافت کے ضمن میں بھی مندرجہ بالا سارے حقائق کی تصدیق ہوتی ہے۔ مضمون کے متعلقہ اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

"غالبؔ اور غمگینؔ کے یہ غیر مطبوعہ فارسی خطوط غمگینؔ اکیڈمی گوالیار میں محفوظ ہیں اور مجھے ان کی زیارت عالی جناب .. سردار سیّد غنی محمد شاہ صاحب ۵ قبلہ حسنی الحسینی و القادری المعروف بہ حضرت جی سجادہ نشین خانقاہ عالیہ اور ان کے فرزند پیرزادہ رشید، پیرزادہ ہاشمی، میاں سیّد رضا محمد شاہ ۵ صاحب حضرت جی زاد لطفہ، فقیر منزل گوالیار کے لطفِ نہایت سے نصیب ہوئی۔ جس کے لیے بہ دل ممنون ہوں۔

غالبؔ نے جو خطوط حضرت غمگینؔ کی خدمت میں ارسال کیے تھے وہ اور ان کے جوابات جو حضرت نے تحریر فرمائے مجھے ان کو حافظ ہدایت النبی قادری گوالیاری نے نقل کر کے ایک مجلّہ میں جمع کر لیا ہے۔ جس میں ۹۴ صفحات ہیں تختی "9x"11 انچ ہے۔

ضمیمہ۵ (شجرہ ص ا۔ میر سید علی غمگین دہلوی حیات شخصیت اور شاعری مرتبہ ڈاکٹر سید جمیل اختر اسسٹنٹ پروفیسر اردو، کملا راجہ کالج گوالیار۔ ہندوستان۔)

افسوس ہے کہ اصل خطوط غالبؔ اور غمگیںؔ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے محفوظ نہیں ہیں۔ لیکن ان کے اصل اور حقیقی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں نے بعض خطوط کے خلاصے کر لیے ہیں بعض تمام و کمال نقل کر لیے ہیں اور بعض کی نقلیں جناب سیّد رضا محمد شاہ صاحب قادری نے کمال مہربانی سے عطا فرمائی ہیں۔''

''(حضرت) سید علی دہلوی گوالیار کے ساکن تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد تھا جو دہلی کے گورنر شاہ نظام الدین احمد قادری (تلمیذ رنگین) کے بھتیجے تھے۔ غمگین کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب ان کی عمر بارہ سال تھی۔ ۲۵[1] برس کی عمر میں درویشی اختیار کی اور سید فتح علی رضوی سے بیعت ہوئے۔ اس کے بعد گوالیر سے پٹنے اور پٹنے سے گیا کا سفر کیا۔ گیا میں ان کو حضرت شاہ ابوالبرکات کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا جن کے مشورے سے وہ بارہ برس تک پٹنے میں رہے، جہاں انہوں نے خواجہ ابوالحسین سے فیض باطنی حاصل کیا اور ان کے حلقہء ارادت میں شامل ہو گئے۔

''مکاشفات الاسرار میں حضرت غمگین نے اپنے حالات لکھے ہیں۔ اس لیے دیباچہ اہمیت سے خالی نہیں۔ یہاں اس کے چند حصے نقل کیے جاتے ہیں۔

''مجملاً از احوال خود بعرض احباب صفوت انتساب می رساند کہ ایں فقیر ابن سید محمد بن احمد بن سید شاہ پیر بن سید محی الدین بن سید شیر محمد القادری کہ در برہان پور آسودہ اندو زیارت گاہ خلائق انداز اولاد سید محی الدین عبدالقادر جیلانی است۔۔۔ وجدہ فقیر بنت خواجہ الٰہی بن خواجہ بہاؤلدین بن خواجہ عبداللہ المشتہر بہ خواجہ خورد محقق ابن خواجہ باقی باللہ الحسنی المتخلص بہ بیرنگ قدس اللہ اسرار ہم است کہ در دہلی زیارت گاہ خلائق اند۔۔۔ فقیر دوازدہ سال بود کہ والد بعالم بقا رحلت فرمودند۔ گاہ گاہ ایں خیال می آمد کہ از کسے دوستِ حق بہ پیوندم و تعلیم راہ حق از د حاصل نمایم۔ چوں (بہ) عمر بست و پنج سالگی رسیدم بہ تحصیل علوم مشغولی ورزیدم وچنیکہ عمر بہ بست و نہ سالگی رسید شبے درخواب دیدم کہ

---

[1] پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب سے یہاں اشتباہ ہوا ہے۔ مکاشفات الاسرار کے دیباچے کے مطابق حضرت غمگین نے حضرت فتح علی شاہ گردیزی کی بیعت (۲۹) انتیس سال کی عمر میں کی چنانچہ درویشی اختیار کرنے کی عمر انتیس سال تھی (۲۵) پچیس سال نہیں۔ (مرتب و مترجم)

شخصے می گوید کہ ترا عم تو سید شاہ نظام الدین احمد قادریؒ می طلبند''۔ اس خواب کی تعبیر حضرت فتح علی شاہ گردیزی نے بیان کی اور فرمایا'' کہ تعبیر ایں خواب ہمیں است، ترا مبارکباد، بروز جمعہ پیش ما آئی۔ پس روز جمعہ حسب ارشاد رسیدم واز دولتِ بیعت وطریقہ فائز گشتم''۔

''اس دیباچے سے حضرت غمگینؒ کی ادبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔''از زمان سابق دیوانِ ریختہ گفتہ بودم آں رادور کردم الحال کہ عمر بہ شصت سالگی رسیدہ انچہ کہ واردات بر من غالب بودند موافق آں با دیوانِ دیگر درحالات واردات وذوق وشوق حقیقی ومجازی خود ترتیب دادم وبعضے غزلیات مخصوصہ'' دیوان سابق دریں دیوان لاحق مندرج ساختم وچوں دیوان نو بہ اتمام رسید وواردات وغلبات وکیفیات بردلم استیلا داشت ، خواستم کہ برائے برادرِ دینی عزیز از جان اسد اللہ خان مرزا نوشہ متخلص بہ غالب واسد کہ دریں زمانہ درنظم ونثر نظیر خودندارند۔۔۔ ترتیب دہم''۔

''حضرت غمگین نے مکاشفات الاسرار کی شرح بھی لکھی ہے جس کا نام''مرأت حقیقت'' ہے۔ اس کے علاوہ ایک کتاب شغل واشغال میں بھی لکھی ہے جو ارشاد الحسنین کے نام سے مشہور ہے اس لیے کہ حضرت سید فتح علی گردیزی کے ارشادات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا نام'' جواہرِ نفسیہ'' ہے۔

''حضرت غمگین کے حالات ان کی تصنیفات کے علاوہ دوسرے بزرگوں کے ملفوظات میں بھی ملتے ہیں۔'' کیفیت العارفین'' میں لکھا ہے۔

''چوں حضرت قطب العاشقین (حضرت ابوالبرکات) ہجوم خلائق بہ خود دیدند آں زماں اکثر طالبان راہ راجہت تربیت یافتن باطن تفویض خلف الرشید خود حضرت خواجہ الوالحسن صاحبؒ فرمودند۔ چنانچہ درآں روزھا سید علی شاہ (غمگین) از گوالیار طالبِ نعمت باطنیہ گشتہ بہ خدمت حضرت قطب العاشقین آمد تربیت یافتہ، مشرف از خلافت از خواجہ ابوالحسن صاحب گردیدہ مراجعت بہ سمت گوالیار کردند۔۔۔''

''یہ ماخذ سوانح غمگین کے سلسلے میں اہم ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان سے نہ تو تاریخ ولادت معلوم ہوتی ہے اور نہ تاریخ وفات۔ غمگین اکادمی میں ایک وظیفے کی کتاب ہے۔ اس میں حافظ میاں

عبدالرزاق میاں میرن علی المتخلص بہ رزاق کے قلم سے حضرت غمگین کی تاریخ ولادت یکم صفر ۱۱۶۷ھ (مطابق ۱۷۵۳ء) اور تاریخِ وفات ۳ صفر ۱۲۶۸ھ (مطابق ۱۸۵۱ء) لکھی ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو سابقہ بیانات کی رو سے ۹۲ سال کی عمر یعنی ۱۱۹۶ھ (مطابق ۱۷۷۲ء) میں بیعت ہوئے اور ان کی نئی زندگی کا آغاز ساٹھ سال کی عمر یعنی ۱۲۲۷ھ (مطابق ۱۸۱۲ء) میں ہوا۔

"غمگین کی وفات پر نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے ایک قطعہ تاریخ کہا ہے جس سے رزاق کی تصدیق ہوتی ہے۔

به عرفِ حضرت و غمگین تخلص شده سید علی فخرِ زمانی
بصورت سالکِ راهِ طریقت بمعنی شاه ملک کامرانی
بدیده محوِ دیدار خدا بود بدل آگه زاسرار نهانی
بطونش دیدهٔ کحل البصیرت ظهورش سرمهٔ چشمِ معانی
دلش چوں یافت ذوقِ ربّ ارنی خطاب آمد که تو در خود نمانی
به یک شنبه سوم روزِ صفر شد کلیم آسا بزیرِ کوه فانی
زدل آ ہے کشیده شیفته گفت "به برد اورا صدائے لن ترانی"
۱۲۶۸ھ = (۱۸۵۱ء)

غمگین کا ذکر بعض تذکروں میں بھی ہے "عمدۂ منتخبہ" (تذکرۂ سرور) میں لکھا ہے "غمگین تخلص میر سید علی خلف الرشید میر سید محمد مرحوم برادرزادہ حقائق و معارف آگاہ سید شاہ نظام الدین احمد قادری ناظم صوبہ دار الخلافہ تشریحِ بزرگی وحسب نسب محتاج بہ تحریر نیست، مرد بامروّت و قابل است۔ از تصانیف اوست

تو نے صیاد نیا ظلم یہ ایجاد کیا بال و پر توڑ قفس سے مجھے آزاد کیا
ہجر میں اس کے یہ دل جینے سے میرا سیر ہے اے اجل بہر خدا آ جلد اب کیا دیر ہے
دل اس کو دیا اب کیا تدبیر سے ہوتا ہے جو کام کہ ہوتا ہے تقدیر سے ہوتا ہے

''عیار الشعرا'' میں خوب چند ذکا نے لکھا ہے

''میر سید علی غمگین۔۔۔ جوانِ گرم اختلاط و خوش خلق و شگفتہ بیان، سعادت آثار، ستودہ اطوار، پر حلم و حیا معلوم شد۔ بہ اصلاحِ سعادت یار خان رنگین گلہائے اشعارِ آب دار خود را رنگ و بوئے تازہ بخشیدہ ہمگی دیوان معروف او بہ نظرِ ایں فقیر انواع المعانی آمدہ'' اس کے بعد نمونہ سات اشعار دیے ہیں۔

نکلتا ہے جو اشک آنکھوں سے میرا، ارغوانی ہے	مرا اس عشق کی دولت سے چہرہ ارغوانی ہے
خس کا شعلے کے سوا کوئی خریدار نہیں	مہرباں کوئی مرا جز غمِ دلدار نہیں
آخر اس شوخ نے جلا مارا	مضطرب تھا دل اپنا جوں پارا
بعد از آں کعبہ کو بھی کر کے سفر دیکھ لیا	ایک مدت رہے (ہم) عشق بتاں میں غمگیں

سرور اور ذکا وغیرہ کے تذکروں میں جن اشعار کو منتخب کیا گیا ہے وہ موجودہ دیوان غمگین میں نہیں ہیں۔ اس لیے قرینہ غالب ہے کہ یہ اشعار اس دیوانِ اول کے ہیں جو ۱۱۹۷ھ سے پہلے ترتیب دیا گیا تھا اور جو بیعت کے بعد غمگین نے خود ہی مسترد کر دیا تھا۔

غمگین کا ذکر مجموعۂ نغز'' میں بھی ہے۔ اس کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

''غمگین تخلص۔۔۔ جوانے نیک زندگانی، کشادہ پیشانی، خوش اختلاط، مستحکم ارتباط، یار باش، محبت تلاش، مخلص نواز، مخالف گداز، باعز و تمکین، شاگردِ سعادت یار خان رنگین است علی قدرِ حال خطِ نسق (کذلک) می نویسد و کم کم فکرِ سخن می گزیند و بافرح و سرورِ ایامِ بے بدل جوانی بکام دل بسر می برد۔ ایں شعر از و منسوب است۔

جو کہ دیکھے ہے سو آنکھوں سے لگاتا ہے مجھے	گو سیہ بخت ہوں پر سرمۂ بینائی ہوں

ایں شعر سرقہء طالب کلیم است امابزبان خود خوب گفتہ

''مجالس رنگین'' میں غمگین کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ انہوں نے غمگین کو اپنا شاگرد لکھا

ہے اور اپنی وہ غزل دی ہے (مان کر۔ جان کر) جو انہوں نے جرأت کی زمین میں غمگین کی فرمائش پر فی البدیہہ کہی تھی۔ دوسرے موقع پر غمگینؔ کے دس شعر نقل کیے ہیں جو انہوں نے ڈھاکے میں چند دوستوں کے سامنے ایک کشتی کی سواری کے دوران پڑھے تھے۔

''غمگینؔ نے بھی رنگین کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔ قطعہ تاریخ میں لکھا ہے۔

جب استاد رنگیں جہاں سے گئے | تو اک یادگاری رہی ریختی
خرد نے کہا یہ ہی تاریخ ہے | کہ ساتھ ان کے غمگیں گئی ریختی

''غمگینؔ کا تذکرہ کریم الدین (تذکرہ کریم الدین) نساخ ''سخن شعرا'' شیفتہ ''گلشن بے خار'' اور عبدالحیٔ صفا ''شمیم سخن'' نے بھی کیا ہے لیکن کوئی نئی یا خاص بات نہیں کہی ہے۔۔۔ مولانا محمد حسین آزاد نے البتہ ان کا ذکر استادوں میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ نواب الٰہی بخش خاں معروف نے بھی غمگین سے مشورہ سخن کیا تھا۔

''حضرت غمگینؔ کے دیوانِ غزلیات یعنی ''مخزن الاسرار'' کا نسخہ کتب خانہ غمگین اکادمی گوالیار میں موجود ہے اس سے چند اشعار انتخاب کیے جاتے ہیں۔

اس کے وعدے پر اعتبار کیا | ہائے پھر شب کو انتظار کیا
پھر لگا وہ لگاوٹیں کرنے | پھر مرے دل کو بے قرار کیا
ہے مجھے کس کی چاہ، مت پوچھو | نہ کہو لگا میں آہ مت پوچھو
کیا کہوں حسن اس صنم کا میں | ہے خدا کی پناہ مت پوچھو

''غمگین نے ''مخزن الاسرار'' میں جا بجا مرزا اسد اللہ خان غالب کے انتخابِ کلام کی تعریف کی ہے۔

بہت سی سیر دواوین ہم نے کی غمگین | مگر اسد کے نہیں انتخاب سے نسبت
اسد کا انتخاب اپنی تسلی کو کیا پیدا | جب آیا تنگ شعرِ شاعراں کی انتخابی سے

''غمگینؔ نے غالب کو'' برادرِ دینی'' لکھا ہے اور یہ کہ نظم ونثر میں ان کا اس زمانے میں ثانی نہیں غالب نے بھی غمگین کی تعریف پورے جوش عقیدت سے کی ہے اور ایک خط میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ ''یزداں باسپاس گزارم وبدیں ذوق خودراور بازم کہ مرابہ گوشہء خاطر کسے جائے دادہ است کہ تا کام ودہن را بہ بندۂ آب نہ شویم، نامش نہ تواں برد''۔

''اسی خط میں ان کو'' فروغِ کوکب سعادت'' ''بہارِ باغ افادت'' ''منبع فیوضِ نامتناہی'' اور ''واسطۂ حصولِ رحمت الٰہی'' لکھا ہے۔

''غالبؔ اور غمگینؔ کے یہ غیر مطبوعہ فارسی خطوط غمگین اکادمی گوالیار میں محفوظ ہیں اور مجھے ان کی زیارت عالی جناب سردار سید غنی محمد شاہ صاحب قبلہ حسنی الحسینی والقادری المعروف بہ حضرت جی سجادہ نشین خانقاہ عالیہ اور ان کے فرزند رشید پیرزادہ ہاشمی میاں سید رضا محمد شاہ صاحب حضرت جی زاد لطفہ، فقیر منزل گوالیار کے لطف بے نہایت سے نصیب ہوئی۔ جس کے لیے بہ دل ممنون ہوں۔

''غالبؔ نے جو خطوط حضرت غمگینؔ کی خدمت میں ارسال کیے تھے وہ اور ان کے جوابات جو حضرت نے تحریر فرمائے تھے ان کو حافظ ہدایت النبی قادری گوالیاری نے نقل کر کے ایک مجلّہ میں جمع کر لیا ہے جس میں ۹۴ صفحات ہیں۔ تختی ۱۱x۹ انچ ہے۔

''افسوس ہے کہ اصل خطوط غالب اور غمگین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے محفوظ نہیں ہیں لیکن ان کے اصل اور حقیقی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں نے بعض خطوں کے خلاصے کر لیے ہیں بعض تمام وکمال نقل کر لیے ہیں اور بعض کی نقلیں جناب سید رضا محمد شاہ صاحب قادری نے کمال مہربانی سے عطا فرمائی ہیں۔

''اس سلسلے کا پہلا خط غالب کا ہے۔۔۔ اس کے پڑھنے سے معوم ہوتا ہے کہ حضرت جی نے غالب سے پوچھا تھا کہ میں دیوانِ رباعیات کے دیباچے میں آپ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اعتراض تو نہیں ۔ اس کے جواب میں غالب لکھتے ہیں کہ دیباچے میں میرا ذکر میرے لے ہی نہیں میرے آبا کے لیے'' سرمایہ نازش جاودانی'' ہے۔ (پھر) معلوم ہوتا ہے کہ حضرت غمگین نے لکھا

تھا کہ میرے دیوان رباعیات کو غیر کی نظروں سے پوشیدہ رکھے گا۔ غالب لکھتے ہیں کہ یہاں غیر کون ہے اور ان حقائق و معارف کے سمجھنے والے کتنے ہیں اور جو سمجھتے ہیں وہ غیر نہیں۔''

خواجہ احمد فاروقی کے اس طویل اقتباس کے بعد اس مضمون کے عنوان اور اس مکاتبت کے مجموعی پسِ منظر کو نظر میں رکھتے ہوئے اب میں روئے سخن زیادہ اہم موضوع کی طرف کرتا ہوں۔ ظاہر ہے یہ موضوع وہ تعلق خاطر ہے جو ان دونوں حضرات یعنی غالبؔ اور حضرت غمگینؔ کے درمیان تھا۔ قاری کی تشفی کے لیے اس تعلق کی نوعیت کا تعین ہی اس موضوع کا سب سے اہم پہلو ہے۔

چونکہ گزشتہ سات آٹھ سالوں میں صورت حال میں تبدیلی آچکی ہے اور حضرت غمگینؔ کے ورثائے باہمت کے طفیل ان کے بہت سے آثار طبع ہو کر ہماری دسترس میں آگئے ہیں اور ان کی شخصیت پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جو ادب کے ایک وسیع حلقے تک پہنچ چکا ہے اس لیے ان موضوعات سے جو تازہ ترین مطبوعات کے سبب ادب کے منظر نامے پر ابھرے ہیں، اس تعلق کی نوعیت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

ان تازہ ترین مطبوعات میں ایک تو ''میر سیّد علی غمگینؔ دہلوی۔ حیات، شخصیت اور شاعری'' کے عنوان سے ایک طویل تحقیقی مقالہ ہے جو ۴۲۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے مرتب ڈاکٹر سید جمیل اختر (اختر نظمی) اسسٹنٹ پروفیسر آف اردو کملا راجہ گرلز کالج گوالیار ہیں۔ اس مقالے پر ان کو جبل پور یونیورسٹی انڈیا سے ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹریٹ کی سند عطا ہوئی۔ یہ کتاب ڈاکٹر مذکور کی بیوہ کی اجازت سے علمی کتاب گھر کراچی سے حضرت غمگینؔ کے ایک وارثِ ارجمند نسیم حضرت جی حال مقیم کراچی نے پہلی بار ۲۰۰۸ میں نشر کی۔ اس سلسلے کی ''میر سیّد علی غمگینؔ دہلوی المعروف بہ حضرت جی'' کے عنوان سے حضرت غمگینؔ پر لکھے گئے (۳۳) تینتیس اردو مقالات پر مشتمل دوسری کتاب ہے۔ ان مقالہ نگاروں میں گذشتگانِ اردو ادب میں سعادت یار خان رنگینؔ اور مصطفیٰ خان شیفتہ سے لے کر معاصر مشاہیر میں خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی اور راغبؔ مراد آبادی تک شامل ہیں۔ اس کتاب کا سال کتابت درج نہیں لیکن یہ بھی پہلی کتاب کی طرح حضرت غمگینؔ کے وارث مکرم نسیم

حضرت جی نے ماضی قریب میں مرتب کر کے علمی کتاب گھر کراچی سے شائع کی ہے۔ قرائن یہ کہتے ہیں کہ یہ کتاب بھی ورثائے مکرم کی اسی منظم کوشش کا حصہ ہے جو انہوں نے حضرت غمگیںؔ کے آثار اور ان کی شخصیت و کردار کی اشاعت کے ضمن میں چند سال سے شروع کر رکھی ہے۔ اس مجموعۂ مضامین کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس مجموعے میں جو ۳۳ مقالات پر مشتمل ہے بارہ مقالے صرف پروفیسر محمد مسعود احمد کے تحریر کردہ ہیں۔ گویا یہ پروفیسر محمد مسعود احمد، حضرت غمگیںؔ کے مخصیصن میں سے ہیں۔ میں اپنے قارئین محترم کو بتاتا چلوں یہ وہی پروفیسر محمد مسعود حمد ہیں جن کے ذریعے غالبؔ اور غمگیںؔ کے مکتوبات جناب ڈاکٹر سیّد عبداللہ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کو دستیاب ہوئے تھے اور نتیجۃً ۱۹۶۴ء میں کالج میگزین میں طباعت پذیر ہوئے۔

اب اس تعلق خاطر کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک ثقافتی اور دوسرا روحانی۔ اتفاق سے ان دونوں پہلوؤں کے ضمن میں پروفیسر مسعود احمد نے اپنے دو مقالوں میں یہ ارشادات فرمائے ہیں۔

بحوالہ کتاب بعنوان میر سید علی غمگیںؔ المعروف بہ حضرت جی۔ مقالہ بعنوان حضرت غمگیںؔ شاہ جہان آبادی ص ۹۰۔ ''مندرجہ بالا اقتباسات سے اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ مرزا غالبؔ حضرت غمگیںؔ سے بے حد متاثر تھے یا یوں کہیے کہ انہوں نے ان کو اپنا روحانی پیشوا اور استادِ سخن تسلیم کر لیا تھا'' اسی کتاب میں ایک دوسرے مقالے بعنوان ''غمگیںؔ اور غالبؔ'' میں ص ۲۵۳ پر فرماتے ہیں ''اس روحانی تعلق اور عقیدت کے علاوہ ادبی تعلق بھی تھا۔ حضرت غمگیںؔ داد و تحسین کے لیے اپنا کلام ارسال فرماتے اور مرزا غالبؔ اصلاح کے لیے اپنا کلام بھیجتے۔''

پروفیسر مذکور کے ان دونوں نتائج یعنی ''روحانی پیشوا اور روحانی تعلق و عقیدت'' سے پہلے میں ''استادِ سخن تسلیم کر لیا تھا'' اور ''غالبؔ اصلاح کیلئے اپنا کلام بھیجتے تھے'' پر بات کرتا ہوں خوف طوالت سے میں خطوط کے وہ اقتباسات نقل نہیں کرنا چاہتا لیکن ''استادِ سخن'' اور ''اصلاح کلام'' کے ضمن میں جن الفاظ کے سبب موصوف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ غالبؔ حضرت غمگیںؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے وہ غالبؔ کے نویں خط کے یہ الفاظ ہیں ''دراں روز با غزلے درمیان احباب طرح شدہ

و در آں زمیں دہ بیت گفتہ شدہ بود، بہ چشم داشتِ اصلاح دریں ورق نگارش می پذیرد۔'' (ترجمہ: ان دنوں دوستوں میں ایک غزل کی طرح پڑی۔ دس اشعار میں نے بھی کہے ہیں۔ اس خط میں آپ کی اصلاح کی نیت سے تحریر کی جاتی ہے) اور پھر غالبؔ نے اس غزل کا ایک شعر بھی لکھا ہے۔ اور وہ شعر یہ ہے۔[۶]

" در وصل دل آزاریٔ اغیار ندانم
دانند کہ من دیدہ ز دیدار ندانم"

گویا انہوں نے '' بہ چشم داشت اصلاح'' کو اس کے لغوی معنی میں لیا اور چونکہ عقیدت مندی اور روحانی تعلق نے بنیاد پہلے ہی تیار کر دی تھی، ایک پوری عمارت کھڑی کر دی۔

اس معاشرے میں جہاں کسی قسم کے ملکی، قومی، اجتماعی، سیاسی، معاشرتی اہداف نہیں تھے، معاشرے کے لیے صرف شاعری ہی وہ مشغلہ تھا جس میں اس کے اشراف منہمک تھے، اور اسی کو اپنی انفرادی و اجتماعی فکری مسائی کا منتہا تصور کرتے۔ بادشاہ شاعری کرتا تھا، شہزادے شاعری کرتے تھے، امرا شاعری کرتے تھے، متوسلین شاعری کرتے تھے۔ شاعری سارے معاشرے میں ایک قدر امتیاز تھی۔ ایسے ماحول میں احباب دور افتادہ دوستوں کو اپنی تازہ غزلیں ارسال کیا کرتے تھے اور اس وقت کے ادبی ماحول کی ساری کروٹیں غزلوں کے اس وسیع تبادلے ہی سے متعین ہوتیں۔ تعلق خاطر کی شادابی بھی اس ہی تبادلے سے ہوتی اور خیر و عافیت کی آگاہی بھی۔ چنانچہ قرائن یہ کہتے ہیں کہ غمگینؔ اپنی غزلیں غالبؔ کو ارسال کیا کرتے اور اسی طرح غالبؔ اپنی تازہ واردات قلب ان کو بھیج کر داد کے خواہاں ہوتے۔ اب چونکہ یہ خط و کتابت ایسے وقت میں شروع ہوئی ہے یا کم از کم دستاویزی ثبوت اس وقت کے ہیں جب غالبؔ نہ صرف بہ حیثیت شاعر بلکہ بہ حیثیت نثر نگار بھی اس وقت کے ہندوستان میں بڑی مستند و مسلّم حیثیت رکھتے تھے، اس لیے ان شواہد سے جو طرفین کی غزلوں کی فرستادگی سے متعلق ہیں فکر سلیم تو یہی کہتی ہے کہ یہ رفیقانہ غزلوں کا تبادلہ ایک خالص ثقافتی

ضمیمہ[۶] غالبؔ کی محولہ بالا غزل جو دس اشعار پر مشتمل ہے۔ میر سید علی غمگینؔ مرتبہ نسیم حضرت جی ص ۲۰۵۔

وفکری عمل تھا۔ شاگردی و استادی والی بات نہیں تھی ۔ یہ ایک بالغانہ فکری سطح پر ہدیات کا تبادلہ تھا۔ طلبِ ہدایت کم از کم غالبؔ کی طرف سے تو ہرگز نہیں تھی۔ لیکن اگر پھر بھی خانقاہی ارادت مندی ''بہ چشم داشت اصلاح'' کے لغوی معنی لے تو میں سمجھتا ہوں کہ فاضل مقالہ نگار نے اس دور کی انتہائی مہذب ثقافت اور اس کے پُر پیچ و پُر تصنع طرزِ اظہار کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس رویے سے غالبؔ کے فارسی خطوط پر مبنی پانچ متداولہ کتابوں میں بکھری ساری انشاء نگاری بھی داد سے محروم رہی۔

اب میں ڈاکٹر سیّد جمیل اختر (اختر نظمی) اسسٹنٹ پروفیسر آف اردو کملا راجہ کالج گوالیار ہندوستان کی محولہ بالا کتاب بعنوان میر سیّد علی غمگین دہلوی ص ۱۰۶ سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جو کلیتاً اسی موضوع پر ہے اور میری رائے کی تائید کرتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

''مرزا غالبؔ کے مکاتیب سے یہ بات ظاہر ہے کہ وہ حضرت غمگینؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے اور دونوں کی عمروں میں بھی بڑا تفاوت تھا۔ لہٰذا مرزا نے انکساری کے جذبے کے تحت مندرجہ بالا عبارت لکھی ہوگی۔ مقصد وہ نہ ہوگا جو الفاظ سے ظاہر ہے کیونکہ مرزا غالبؔ اور حضرت غمگینؔ کے مکاتیب میں کہیں اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ دونوں کے درمیان استادی و شاگردی کا تعلق رہا ہو۔ حضرت غمگینؒ نے اپنے ایک مکتوب میں مرزا غالبؔ سے فرمائش کی تھی کہ وہ ان کا کلام اوّل تا آخر دیکھ لیں۔ اگر مرزا غالبؔ کے مکتوب کی روشنی میں حضرت غمگینؒ کو ان کا استاد تسلیم کر لیا جائے تو حضرت غمگینؒ کے مکتوب سے کیا نتیجہ اخذ کیا جائے گا؟''

اپنی اسی رائے کی تائید میں اب میں جناب قاضی عبدالودود کے ایک مقالے کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ ملحوظ رہے کہ قاضی عبدالودود اپنی باریک بینی وتنقیدی فراست کے لحاظ سے ہندوستان و پاکستان کے محققین میں سرخیل تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ اپنے مقالہ بعنوان غمگینؔ دہلوی جو نسیم حضرت جی یکے از خاندانِ حضرت غمگین کے نشر کردہ مجموعۂ مقالات بنام میر سیّد علی غمگینؔ دہلوی میں طبع ہوا ہے ص ۲۷ پر فرماتے ہیں۔

''غالبؔ پنج آہنگ کے ایک خط میں صراحتہً کہتے ہیں میں فن سخن میں کسی کا شاگرد نہیں اگر غمگینؔ کو کچھ بھیجا اور یہ لکھا کہ بنظر اصلاح ملاحظہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ پختگی عمر پر پہنچ جانے اور خود استاد علم ہو جانے کے بعد غالبؔ کو اپنے کلام کی خامیوں کا اس قدر احساس ہوا کہ کسی کو استاد بنانا منظور ہوا۔ بہ نظر اصلاح دیکھنے کی استدعا انہوں نے نبی بخش حقیرؔ (شاگرد غالب) سے بھی کی تھی۔ ایسی باتیں مخاطب کو خوش کرنے کے لیے لکھی جاتی تھیں ان کو ان کے لغوی معنی میں نہیں لینا چاہیے۔''

یہ لیجئے ''استادِ سخن'' اور ''بہ چشم داشتِ اصلاح'' کا تو پردہ چاک ہو گیا۔ اب میں اس تعلق کے روحانی پہلو پر آتا ہوں یعنی غالبؔ کے حضرت غمگینؒ سے بیعت کرنے اور ان کی مریدی اختیار کر لینے پر۔ یہاں ایک بار پھر مجھے پروفیسر محمد مسعود احمد کے اس مقالے کا حوالہ دینا ہے جو اسی مجموعۂ مقالات میں ہے جو میر سید علی غمگینؔ دہلوی المعروف بہ حضرت جی مرتبہ نسیم حضرت جی (سال طباعت ندارد) حال ہی میں علمی کتاب گھر کراچی سے طبع ہوا ہے۔ آپ اپنے مقالے میں ص ۲۵۱ پر فرماتے ہیں
''قرائن و شواہد سے ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے حضرت غمگینؔ سے غائبانہ بیعت بھی حاصل کر لی تھی۔ مرزا غالب نے اپنے مکاتیب میں کئی مقامات پر حضرت غمگین کو پیر و مرشد کہہ کر خطاب کیا ہے۔ ممکن ہے اس کو بعض لوگ غالبؔ کی کسر نفسی پر محمول کریں۔ ایسا بھی ممکن ہے۔ اس اقتباس سے غالبؔ کی کمال عقیدت کا اظہار ہوتا ہے''

اس سے پیشتر کہ میں خود کچھ عرض کروں بات کو مختصر کرنے کے لیے اور وہ بھی اس طرح کہ نتیجہ خیز ہو میں ایک بار پھر اس موضوع پر اپنے وقت کے مشہور ترین نقاد و محقق جناب قاضی عبدالودود کے اسی مقالے کا حوالہ دیتا ہوں جس میں انہوں نے غالبؔ کے تلمذ کو باطل قرار دیا تھا۔ ایک بار پھر انہوں نے بھی اسی مقالے کا ذکر کیا ہے جو مجلّہ برہان میں چھپا تھا۔ لیکن مقالہ نگار کا نام نہیں لکھا۔ اغلب ہے کہ وہ مقالہ نگار یہ پروفیسر مسعود ہی ہوں۔ سو قاضی صاحب فرماتے ہیں۔

''مقالہ نگار برہان کا قول ہے کہ غالب نے ایک خط میں خود کو مرید لکھا ہے ص ۲۶۴۔ اور

ہمیشہ ''خروانہ'' نہیں بلکہ ''مریدانہ'' عقیدت وارادت سے پیش آتے تھے۔ اگر ان کی مراد یہ ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر مرید تھے تو مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ غالبؔ شاہ فخر الدین صاحب کے سلسلے میں کسی کے مرید تھے جیسا کہ انہوں نے صراحتہً ایک خط میں لکھا ہے اور جو خطوط غالبؔ میں ہے۔ اس خط میں انہوں نے یہ بات ایک بیان واقعہ کے طور پر لکھی ہے کسی کو خوش کرنا مقصود نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بہادر شاہ کے مرید تھے اور اس کی بنا محض خوشامد پر تھی۔''

مزید یہ عرض ہے کہ اول تو میں پروفیسر کی رائے کو کوئی فیصلہ کن سوچ یا رائے ہی نہیں سمجھتا اور وہ اس وجہ سے کہ یہ لکھنے کے بعد کہ ''مرزا غالبؔ نے اپنے مکاتیب میں کئی مقامات پر حضرت غمگین کو ''پیر ومرشد'' لکھا ہے۔'' خود ہی لکھتے ہیں ''ممکن ہے اس کو کچھ لوگ کسر نفسی پر محمول کریں ایسا بھی ممکن ہے''۔ گویا انہیں خود ہی اپنی رائے پر یقین کامل نہیں اور انہیں خود بھی نظر آتا ہے کہ دوسری بات کا جو ان کی بات کے خلاف ہے امکان موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ ان ہی خطوط میں کئی ایسے موارد ات ہیں جہاں غالبؔ کی لفظی قدرت بیان اور انشاء نگاری اپنی معراج پر ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے یہ کہہ کر قلم توڑ دیا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ماشاء اللہ ان کا قلم کہیں ٹوٹتا نہیں ہر دوسرے موڑ پر وہ سابقہ مرحلے سے بڑھ کر رواں دواں نظر آتا ہے۔

اس ضمن میں قارئین کرام کی توجہ میں اس حقیقت کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ پروفیسر موصوف نے صرف غمگین کے خطوط پڑھ کر یہ حکم لگا دیا کہ غالب نے چونکہ ان کے احترام میں ایسے بلند بانگ، پرشور اور اثر انگیز الفاظ استعمال کیے اور دو خطوط میں ان کو پیر ومرشد لکھ دیا تو وہ ان کے مرشد ہو گئے اور انہوں نے مکتوب الیہ سے بیعت کر لی۔ میں غالبؔ کے صرف ایک مجموعۂ مکاتیب بعنوان نامہ ہائے فارسی غالبؔ کے مکتوب الیہ محمد علی خان کے خطوط کا حوالہ دیتا ہوں یہ چوبیس خطوط ہیں۔ ایک ایسے شخص کو لکھے گئے ہیں جو غالبؔ کے دوستوں میں بھی شمار ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ہم عمر بھی ہوں۔ وہ غالبؔ کے محسن بھی تھے کہ وہ سفر کلکتہ میں ان کی مدد کرتے رہے تھے۔ چوبیس خطوط میں سے تقریباً اکیس خط ایسے ہیں جن کے القاب اس طرح کے ہیں ''قبلہ قبلہ پرستان

وکعبۂ حق پژوہاں سلامت، یا فرماں روائے کشورِ آگہی ملاذ و مطاع رہی، سلامت۔ وغیرہ وغیرہ۔ خوف طوالت سے میں کسی خط کا اقتباس پیش نہیں کر رہا البتہ صرف ایک خط کے ابتدائی چند کلمات اپنے قارئین کے ذوقِ نظر کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ اس میں اظہار عجز وعبودیت بیانِ ارادت و عقیدت اور پُر شور اور اثر انگیز عقیدت کا مختصر نمونہ دیکھیے۔ یہ ایک فارسی خط کی ابتدا ہے جو غالبؔ نے نواب سیّد علی اکبر خان متولی امام باڑہ ہوگلی بندر کو لکھا ہے۔ غالبؔ کے سفر کلکتہ کے دوران نواب صاحب سے ان کا بڑا قریبی تعلق تھا اور وہ ان کو پنشن کے امور میں مشورہ بھی دیا کرتے تھے۔ یہ خط کلیاتِ مکتوبات فارسیِ غالبؔ میں ص ۳ پر ہے۔ اور ترتیب خطوط میں چوتھا۔

''اعلیٰ حضرت نواب صاحب قبلہ وکعبۂ کونین مدظلہ العالی

اپنی پیشانی کو آپ کے آستانے کی ہوس میں سجدہ ریز اور اپنی سانس کو غم خواری کے اظہار کے ذوق میں زمزمہ خیز کر کے عرض کرتا ہے کہ جمعہ کے دن جناب عالی کا نامۂ منور مقصود کا خاورستان بن گیا میں نے اس دنیا کے پیدا کرنے والے منصف یگانہ کی خدمت میں نماز ادا کی اور اپنے بخت بلند کا شکر ادا کیا کہ مجھے بے کس نہیں چھوڑا گیا اور اپنی درگاہ کے منتخبین کو میری دل جوئی پر مقرر کیا ہے۔ خدا انہیں سلامت رکھے اور تادیر زندہ''۔

اس مختصر اقتباس کے بعد میں بڑے واشگاف انداز میں دعوت دیتا ہوں کہ پروفیسر موصوف اگر ان لکھے گئے سیکڑوں فارسی خطوط میں سے کسی خط کو بھی کھول لیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی غالبؔ کسی حضرت غمگیںؔ سے مخاطب ہیں لیکن ان میں سے کسی سے غالبؔ نے بیعت نہیں کی صرف اس لیے کہ مکتوب الیہ دنیا دار لوگ تھے اور شریعت وطریقت میں سے کسی کے داعی نہیں تھے۔ ان بلند آہنگ القابات اور ان پر شور الفاظ کی گونج میں ''پیر ومرشد'' جیسے الفاظ کلیتاً لایعنی ہو جاتے ہیں مزید یہ کہ اس پیری اور مریدی کا بھرم غالبؔ کے اس استفہامی و جواب طلب رویے سے بھی کھل جاتا ہے جو انہوں نے حضرت غمگیںؔ کو لکھے گئے اپنے پہلے خط میں ''غیر کو'' سے شروع کر کے دسویں خط تک بڑی تاکید وتمکنت سے جاری رکھا۔

غالبؔ کے پہلے ہی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت غمگینؔ نے ان کو تاکید کی تھی کہ رباعیات کا دیوان تو میں آپ کو ارسال کر رہا ہوں لیکن آپ ان رباعیات کو غیروں کی آنکھ سے محفوظ رکھیں۔ غالبؔ انتہائی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اور اپنی سعادت پر شاداں ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''یقیناً ایسا ہی ہوگا'' لیکن دوسرے لمحے ہی ''پیر و مرشد'' پر ایک سوال بھی داغ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ''غیر کہاں ہے؟ — عقل کا فرمان یہ ہے کہ ہر دیکھنے والا الفاظ کے دیکھنے سے معنی کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا (لہذا) ہر وہ شخص کہ اس کے معنی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے غیر نہیں ہوا چونکہ اس عالم میں دیر و حرم کی کوئی تفریق نہیں۔ یہ دلچسپ باتیں کہ گستاخانہ عرض کی گئی ہیں ملحوظ خاطر و ذہن نشین ہوں —'' یہ لیجئے ابھی مرید کے ہاتھ سے مرشد کے ہاتھ کی گرمی رخصت نہیں ہوئی تھی کہ مرید نے ''چون و چرا'' شروع کر دی اور بات کی بھی تو بام تشکیک سے۔ غالبؔ کے تحریر کردہ مندرجہ بالا دو تین جملے دراصل ان سارے لکھے گئے خطوط کا ہی کلیدی خلاصہ نہیں بلکہ غالبؔ کے دین و دنیا و ماورا (غیب) کے رویے اور تصور کا بھی خلاصہ ہیں۔

غالبؔ کے دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غمگینؔ ان کے جواب سے ناخوش ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنا دیوان رباعیات ارسال نہ کرنے کی اطلاع دی ہے۔ ''دیوان رباعیات کے ارسال نہ کرنے کا شہرہ تو ''دور باش'' کی وہ پکار ہے جو دل کو خون اور روح کو فرسودہ کیے دیتی ہے۔'' اور اس کے بعد غالبؔ بہ لطائف و حیل، بہ معذرت و پوزش گزاری معافی کی التجا کرتے ہیں یہاں تک کہ اس دیوان کو نقل کرنے کے لیے خود اپنی خدمات بھی پیش کرتے ہیں ''چونکہ میرا خط بھی برا نہیں اور ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ صحیح لکھ سکوں امید اس امر کی کرتا ہوں کہ یہ خدمت میرے سپرد کر دی جائے اور (مسودے کے) وہ اجزا مجھے بھیج دیے جائیں کہ ان کو نقل کر کے (جناب کی) خدمت میں ارسال کر دوں اور اپنے اوپر احسان کروں۔'' پھر اپنی کم علمی و کم سوادی کا عذر پیش کرتے ہوئے اپنی غزل کا ایک مطلع پیش کرتے ہیں۔

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو
کافر نہ توانی شد ناچار مسلماں شو

اس شعر کا لفظی ترجمہ تو یہ ہوا کہ نیک بختی اور کامرانی سے بھول چوک نہیں ہوتی (لہذا اگر تجھ کو یہ حاصل نہ ہو سکی تو ظاہر ہے تجھ ہی میں کچھ کمی تھی) تو اپنی مساعی پر نادم ہو جا۔ تو کافر بن نہیں سکتا تو ناچار مسلماں ہو جا۔ (یعنی کافر ہونے کے لیے تو بڑی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آرام دہ اور پُرامن زندگی کے لیے مسلمانی ہی درست ہے)۔

گویا غالب اپنی معذرت میں بھی اپنے سابقہ موقف سے ہٹے نہیں ہیں برابر تکرار کر رہے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد جتنے اشعار بھی انہوں نے تحریر کیے ہیں وہ اپنے اس موقف اور نظریے کی تائید ہی میں ہیں۔

چوں پردۂ شب باز مصور بخیال است
ایں کارگہ وہم ز پیدائی اشیا

ترجمہ یہ کارخانۂ وہم و گماں کہ اشیا کی نمود پر مبنی ہے اس طرح ہے جیسے کسی شب بیدار تماشا گر کا خیال ہو۔

اندیشۂ دو صد گل کدہ بردہ بدامن
امّا ہمہ از نقش و نگارِ پر عنقا

ترجمہ فکر نے دو سو گلستانوں کے پھول اپنے دامن میں بھر لیے لیکن یہ سارے پھول عنقا کے پر کے نقش و نگار سے عبارت تھے۔

آئینہ بہ پیش نظر و جلوہ فروزاں
دل پُر ہوس و صاحب بہ خلوت کدہ تنہا

ترجمہ آئینہ نظر کے سامنے ہے اور جلوؤں کی فراوانی ہے، دل پر ہوس مسلط ہے اور خواجہ خلوت تنہا ہے۔

اور پھر تیسرے خط میں تو یہ سپاہی بچہ یہاں تک کہہ ڈالتا ہے "میں جانتا ہوں کہ وہی یکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ دوسرے میری حوصلہ مندی، کوشش ریاضت، دولت و مال و اسباب کا

انحصار ایک دو پیمانہ ہائے شراب پر ہے کہ رات کو پی لیتا ہوں اور مست (ہو کر) سو جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہ میں دین کو سمجھتا ہوں اور نہ دنیا کو۔

اللہ بس باقی ہوس۔"

"وجود ایک وحدت ہے اور اس کی تقسیم ناممکن ہے۔ اس مکتوب نگار کی فہم کے مطابق دین بھی دنیا کی طرح ایک نقش موہوم ہے اور وہم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔۔۔"

مندرجہ بالا خطوط کی دنیا و ماورا (غیب) کی طویل، دقیق اور دل چسپ بحث میں تیسرے خط کے وہ دو اقتباسات جو اوپر پیش کیے گئے طرفین کے دلائل و براہین میں فیصلہ کن اور بالآخر مُسکت دلیل کا حکم رکھتے ہیں اور پھر چھٹے خط تک پہنچتے پہنچتے غالبؔ یہ کہہ کر اس مباحثے کا یکدم دروازہ ہی بند کر دیتے ہیں۔

"خدا جناب عالی کو سلامت رکھے صوفیہ کی باتوں سے تو دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں اگر ان ساری کتابوں کو جمع کیا جائے تو کاغذ کے ڈھیر لگ جائیں لیکن سارے مکالمات کو دل نہیں مانتا اور ان کا ماحصل دل نشین نہیں ہوتا اور جب تک دل ابتداء ہی سے نرم نہ ہو اور یہ رمز کسی کے دل میں نہ بیٹھے تو (یہ سب اس کے لیے) بیچ صحرا کے مرگِ ناکامی کے مترادف ہے اور اس کا کسی صورت حصول مدعا ممکن نہیں۔۔۔۔۔"

اس دل چسپ و طویل بحث کے پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے تو لازم ہو جاتا ہے کہ غالبؔ کو سمجھنے کے لیے ان کی سوانح، ان کی ساری شاعری ان کی ذات و حیات اور پھر زندگی کے سارے رویے کو ایک اکائی کی طرح دیکھا جائے۔ یہ کام صرف حضرت غمگینؔ کے دس فارسی خط پڑھ لینے سے مکمل نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ میں مندرجہ بالا غالبؔ کے دیے گئے خطوط کے اقتباسات کی تھوڑی سی تشریح کے لیے اپنے قاری کو ان کے اردو اور فارسی کے اشعار، کوائف زندگی، عصری تاریخی شواہد، دوستوں، ہم نشینوں اور ہم عصروں کی مستند آرا کی اور ان کے اپنے اعلانات باللسان بھی دکھانا چاہتا ہوں۔ ہر چند یہ کوشش مجھے ان خطوط کے محیط سے باہر لیے جا رہی ہے لیکن موضوع زیرِ بحث اور

شخصیت زیرِ نظر کی تفہیم شافی کے لیے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پہلی بات تو غالبؔ کے بارے میں یہ سمجھ لینی چاہیے کہ غالبؔ کا دین و دنیا و ماورا کا رویہ کوئی وقتی مصلحت یا زندگی کے کمزور لمحوں کی غیر ارادی پکار نہیں تھا۔ یہ بڑا سوچا سمجھا طرزِ فکر تھا جس کی تشکیل میں ان کی زندگی کے مشاہدے کے علاوہ ان کی فطری غیر معمولی ذکاوت اور مختلف ادیان و مذاہب کا وسیع مطالعہ بھی شامل تھا۔ چنانچہ ثواب حاصل کرنے سے ان کی طبیعت اپنے فکری مقتضیات کی بنا پر ابا کرتی تھی۔ اپنے فکری نظریات پر انہیں ایسا کامل یقین تھا کہ وہ ایک انتہائی قدامت پرست معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اس کی پختہ روایات کو علی الاعلان توڑ دینے کی جرأت رکھتے تھے۔ چنانچہ علانیہ شراب بھی پیا کرتے تھے اور اس کو برا نہیں جانتے تھے۔ جس تکرار سے انہوں نے اپنی شاعری میں جنت و دوزخ کے ثبوت میں جو مسلمات نقلی و دلائل پیش کیے ہیں وہ شاعری میں بھی اپنی نظیر نہیں کرتے۔

- با من میاویز اے پسر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

- افتادگی نمازِ دل نا توان ماست
دردِ سر قیام و قعودش نماندہ است

- نیکی ز تست از تو نہ خواہیم مزدِ کار
ور خود بدیم کارِ تو ایں انتقام چیست

- تمنائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا، گنہگار ہیں ہم

سو ان کے دینی نظریات کہ جن کو عرفِ عام میں اعتقادات کہا جاتا ہے اپنے ماحول سے مختلف تھے۔ شیخ اکرام نے ان کے متعلق کہا ہے "ایک بڑا دلچسپ مسئلہ مرزا کا مذہب ہے۔ ان کی تصانیف

سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں عوام سے زیادہ مذہب سے دلچسپی رہی ہے'' اور اسی بات کو ذرا توسیع دیتے ہوئے لکھا ہے'' ان کو مختلف مذاہب اور ان کے متعقدات و معارف سے گہری دلچسپی تھی اور وہ مختلف مذاہب پر تالیف کی گئی اپنے دور کی مستند کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ گویا ان کے سارے اظہارات کے پیچھے وہ عملی ہوں یا تخلیقی، نثر میں یا نظم میں، ایک گہری فکر کارفرما تھی۔ گفتگو میں وہ لطائف و مطائبات ہوں، مکاتیب میں محض عرضِ احوال واقعی اور نظم میں صرف اشعار لیکن ان سب میں ان کی فکر ضرور شامل ہوتی تھی۔'' شیخ اکرام کی اسی بات کی تائید میں میں مولوی سراج الدین احمد کے نام غالب کے ایک خط کا حوالہ دیتا ہوں۔ سراج الدین احمد صاحب نے اپنے خط میں ایک یہودی، کے خسرو اسفندیار کی فارسی کی تصنیف کا جو بعنوان ''داستان مذاہب'' اس زمانے میں پڑھے لکھے طبقے میں بہت مطلوب و مقبول تھی تقاضا دہرایا تھا۔ ان کو غالب اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں ''چونکہ دوبارہ آپ نے فرمایا ہے۔ مجبوراً خاموشی کی مہر منہ سے اور نادانی کا پردہ درمیان سے اٹھا کر عرض کرتا ہوں کہ آپ کو اس کی تلاش میں اپنے آپ کو تھکانا نہ چاہیے۔ چونکہ داستان مذاہب کا مصنف اپنے تمام دعوائے ہمہ دانی کے باوجود جو کچھ بھی کہتا ہے وہ نہ کافی ہے اور نہ ہی سارا کا سارا درست۔'' اس وقت تک غالب اس کتاب کا مطالعہ کر چکے تھے اور اس کتاب کے بارے میں ایک حتمی رائے رکھتے تھے۔

حالی نے یادگار غالب میں ص ۴۷ پر ان کے معتقدات کا خلاصہ کچھ اس طرح پیش کیا ہے ''مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحیدی وجود کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے، توحیدِ وجودی ان کی شاعری کا حصہ بن گئی تھی۔ انہوں نے تمام عبادات و فرائض و واجبات میں سے دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک تو توحیدِ وجودی اور دوسرے اہلِ بیت کی محبت ۔ ۔ اور اسی کو وسیلۂ نجات جانتے تھے اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا لیکن زیادہ تر ان کا میلان طبع شیعت کی طرف پایا جاتا تھا اور وہ جناب امیر کو رسول خدا کے بعد سب سے افضل جانتے تھے۔'' شیخ اکرام نے بھی ان کو اثنا عشری ہی بتایا ہے۔ اور بقول

مالک رام ''وہ ساری عمر کھلے بندوں اپنے شیعی ہونے کا اعلان کرتے رہے اور اس میں ان کے مخالف سنی شیعی دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے بزرگ تھے۔'' چنانچہ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے۔ غالبؔ کے اکثر دینی و ماورائی (غیب کے) نظریات علمی و اکتسابی تھے انہیں مروّجہ عقائد سے کوئی تعلق نہ تھا۔

تصوف بھی ان کے لیے کسی مسلک یا مروّجہ ریاضات کی پیروی یا مسلمہ اقدار کا اتباع نہیں تھا۔ چنانچہ اپنے خط نمبر ۲۔ میں جب وہ حضرت غمگین کو لکھتے ہیں ''میر صاحب مشفق سید امانت علی صاحب کہ جناب عالی کے تربیت یافتگان میں سے ہیں اکثر رات کو مجھ پر نوازش کرتے رہتے ہیں اور جب خلوت نظر آتی ہیں تو راز کی باتیں ہوتی ہیں۔ دو تین دن ہوئے ہونگے کہ بات ''بے رنگی'' کے دائرے میں جا پہنچی۔ یہ روسیاہ چونکہ ان دنوں بے رنگی ہی کے نظارے میں مبتلا ہے میں نے اس بات میں مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا کہ اس سے بلند کوئی اور درجہ نہیں۔ میر سید امانت علی صاحب نے فرمایا کہ اس درجے کا ادراک بھی ایک درجہ ہے۔ میں نے کہا تسلیم۔ لیکن یہ سننے کی بات نہیں یہ ایک امر ہے کہ افراطِ استغراق میں خود بخود حاصل ہو جاتا ہے اور اس درجے کے حصول کا طریقہ بے رنگی ہی میں عدم توجہ ہے نہ یہ کہ اس کی خاطر (اس کے مشاہدے سے) قطع نظر کر لیں تو دوسری صورت میں یہ عام لوگوں کی روش کا اتباع ہو جائے گا ۔ کوئی سمجھے تب ہمہ اوست اور نہ سمجھے تب ہمہ اوست۔'' تو یہ کسی عام مرید کا ''رشد و ہدایات'' کے نتیجے کے طور پر کسی منزل پر پہنچنا نہیں تھا۔ یہ سب کچھ ان کی درّاک طبیعت اور ذہن رسا کا نتیجہ تھا۔

یہاں انتہائی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں حالی کی یادگارِ غالبؔ سے ان کے ذہن کی اس بے پناہ صلاحیت کی تائید میں ایک چھوٹا سا واقعہ بھی پیش کر دوں۔ حالیؔ (ص ٦٦) پر فرماتے ہیں ''مرزا حقائق و معارف کی کتابیں لا کر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ فرماتے تھے کہ شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا مطالعہ کر رہا تھا اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آ نکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا

صاحب کو دکھایا۔ انہوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت سے بیان کیا کہ شاہ صاحب (ولی اللہ) بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔"

سو حالی کی کہی ہوئی بات یعنی توحیدِ وجودی کی مزید تفصیل اور تشریح' غالب کے ان خطوط میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ خط۳ "مجھے تصوف سے کیا واسطہ اور درویشی سے میرا کیا رشتہ لیکن فی الوقت (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) واحدیت وجود اور عدمیت اشیا کو (مشیت نے) میرے ضمیر میں ڈال دیا ہو اور الحق محسوس والخلق معقول کو میرا عقیدہ بنا دیا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ وہی یکتا ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں..... وجود صرف ایک وحدت ہے اور اس کی تقسیم ناممکن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعیان ثابتہ خالق کی خلق پر موقوف نہیں۔ اعیان ثابتہ کا وجودِ مطلق ہی کے ساتھ تعلق ہے۔ جو خطوطِ شعاع کا آفتاب کے ساتھ اور نقوشِ امواج کا دریا کے ساتھ. بے شک (چونکہ) وجود واحد ہے، اس لیے وجود اعیان ثابتہ بھی محض وجود واجب ہے یعنی حق تعالیٰ جل شانہ. اور یہ مثال جودی گئی صرف نوع بشر پر ہی منطبق نہیں ہوتی بلکہ ستاروں، آسمانوں عرش، کرسی شجر حجر حتی کہ زمان و مکان کا بھی یہی حال ہے۔ (درحقیقت) آسمان نہیں یہ فلک کا عینِ ثابتہ ہے۔ اپنی حقیقت گردش اور ذات واحد الوجود میں (اپنے) ارتکاز کے ساتھ، یہ آفتاب نہیں' آفتاب کا عینِ ثابتہ ہے جو اپنی تمام چمک دمک کے ساتھ ذات احدی میں جلوہ گر ہے۔ وقت نہیں ہے بلکہ عین ثابتہ وقت بے مکان کی صورت اور یہ اس ہی کے اعتبارات ہیں جو آج اور کل کی صورت میں وجود مطلق میں شامل ہیں۔ جبکہ ازل سے ابد تک ایک ہی لمحہ واحد ہے اور تحت الثریٰ سے لے کر عرش کی بلندی تک وہی ایک مکان واحد ہے. مختصر یہ کہ اعیان ثابتہ کا موجود نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ تغیر پذیر نہیں ہیں اور ذات (احدیت) سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے اور ہمیشہ اپنے آپ سے اپنے آپ پر ہی روشن ہوتے ہیں......"

اب رہا ان کا شیعیت کی طرف میلان طبع تو میں ان کے وہ اعلانات کہ جو وہ اپنے خطوط کے آخر میں بالتواتر واستمرار کرتے رہے۔ مثلاً! غالب اثنا عشری حیدری بنام غلام حسین قدر علی گرامی

۔۲۔ بندہ عالی ابن ابی طالب۔ اسد اللہ خان۔ المتخلص بہ غالب۔ بنام محمد حسین نا خدا شیرازی
۔۳۔ خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام ہی ہے حق والسلام والاکرام ۔۴۔ علی علی کیا کر اور فارغ
البال رہا کر بنام مجروح، پیش کرتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے اس قسم کے بیسیوں مختصر
بیانات بھی تھے ''میں موحد خاص اور مومن کامل ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت
میں منفرض الاطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمت العالمین ہیں
مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ امر من اللہ ہے، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ
السلام بریں زیستم ہم بریں بگذرم۔'' یہ بیانات بھی ان کی شیعت کی طرف واضح دلیل تھے لیکن ان
سارے اظہارات کے باوجود ان کے اعزا اور ان کے اقربا ان باتوں پر سنجیدگی سے یقین نہیں کرتے
تھے وہ اس سبب سے کہ ان کی آزادہ روی ان کے سارے اعمال پر حاوی تھی۔ بقول ''حالیؔ صلح کل
ان کا دین بھی تھا اور مذہب بھی۔''

چنانچہ لوگ ان کے یہ چھوٹے موٹے بیانات خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لیکن حضرت غمگینؔ سے
مکاتبت کے دوران جب (غالب خط نمبر ۱۰) بات ان تین رباعیات کی آئی جن کے مطالب میں
حضرت علیؑ کو خلیفہ ظاہر کیا گیا تھا تو غالبؔ نے اپنی حُبِ علی ہی کی وضاحت نہیں کی جس میں وہ ہمیشہ
غلو سے کام لیتے بلکہ بڑے زور شور سے ان کو امام بتایا اور امامت کو ایک امر من اللہ۔ اور یہ بھی واضح
کیا کہ خلافت تو ایک وہ عہدہ تھا جو خود حضرت علیؑ نے حکومت کے کام چلانے کے لئے دوسرے
خلفاء کو یکے بعد دیگرے تفویض کیا۔ اس مکاتبت کا یہی نقطۂ عروج اور اتفاقاً یہی نقطۂ انقطاع تھا۔
حضرت غمگینؔ نے اپنے چوتھے خط میں جس شدو مد سے اس عقیدے کی تردید کی ہے اور غالب سے
قرآن و حدیث سے اپنے عقیدے کی تائید میں ثبوت مانگے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو
اپنے آزادہ رو عقیدت مند (میں مرید نہیں لکھ رہا) کی یہ بات پسند نہیں آئی اور انہوں نے اس کو ان
عقائد کے جن میں شیعہ حضرات بھی شامل ہیں خلاف جانتے ہوئے ''اختراع کردہ مذہب'' تصور
کیا۔ اور لکھا کہ ''ہم کہ حضرت علی علیہ السلام کو فضیلت دیتے ہیں تو یہ کلام اللہ اور حدیث کے موافق

ہے، اپنے اختراع کردہ مذہب کے مطابق نہیں۔" اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس مکاتبت کے یہ دونوں خطوط یعنی غالبؔ کا دسواں اور حضرت غمگینؔ کا چوتھا آخری خطوط تھے۔

غرضیکہ دین بہ حیثیت مجموعی ایسا لباس نہ تھا جو غالب کی قامت پر موزوں ہوتا۔ رہے دینی اور مذہبی مخصوص اعتقادات تو ان وجہی ان کی انفرادیت اپنی کلیت میں قبول کرنے کی متحمل نہیں تھی۔ ان کو بھی وہ کاٹ چھانٹ اور تراش خراش کے بعد قابل قبول بناتے تھے اس لیے کہ انہیں اسی دنیا میں رہنا تھا۔" خلاصہ یہ کہ مرزا صاحب ایسے صوفی تھے جو وحدت الوجود پر مکمل ایمان رکھتا ہو اور شراب بھی پیتا ہو اور ایسے سنی تھے جو حضرت ابوبکر اور عمر کی خلافت کو حضرت علی کا عطیہ مانتا ہو اور حضرت علی کو ہر حیثیت سے افضل سمجھتا ہو۔ اسی طرح وہ ایسے شیعہ تھے جو حضرت ابوبکر و عمر کو خلیفہ بلافصل نہ مانتا ہو۔ اس طرح درحقیقت وہ آزادہ رو تھے اور تقلید کو شاعری کی طرح مذہب میں بھی روا نہیں رکھتے تھے اور اپنی روش عام سے ہٹ کر چلنے کی فطرت کو مذہب میں بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔"
(مقالہ میکش اکبرآبادی۔ مرزا غالبؔ ایک صوفی کی حیثیت سے غالب نمبر ص ۶۹ شاعر بمبئی)

اب حضرت غمگینؔ کے مکتوبات: حضرت غمگینؔ نے اپنے پہلے ہی خط میں "عین" اور "غیر" کا ذکر شروع کرتے سالکین کے مبادیات سے بات شروع کی ہے، پورے خط میں ان الفاظ ہی کے مضمرات پر روشنی ڈالی ہے اور تمام مسلکوں کی مسلمہ اقدار کے واسطے سے اُن ریاضات و مساعی کو "راز" میں رکھنے کی تلقین کی ہے جو ان مسالک میں حسب توفیق سالک مرشد کی ہدایت میں کیے جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو تھوڑی سی بھی تصوف سے واقفیت ہو وہ بخوبی ان باتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت غمگینؔ کے دوسرے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کا سوال کرنے کا عقلی رویہ انہیں پسند نہیں آیا لیکن پھر بھی عہد سلف کے بزرگان دین و صالحین کرام کی طرح انہوں نے وسعت قلب کا اظہار کرتے ہوئے غالب کی تعریف کی اور اپنے تعلق خاطر کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ پھر انہوں نے بے رنگی جیسے عمل کے دقیق پہلوؤں پر اپنے تجربے کو پیش کرتے ہوئے واضح کیا کہ انہوں نے اس منزل تک پہنچنے کے لیے جذبی طریقہ اختیار کیا اور "اس سبب سے جذب کی کیفیت میں بیس سال

سے گرفتار ہوں" اور بالآخر غالب پر واضح کیا کہ "عقلی و وجدانی کے درمیان جو فرق ہے وہ واضح ترین ہے۔ (اور وہ اس طرح) کہ عقلی صاحب معرفت جب تک کہ تمام تعینات کو دل سے محو کر کے اپنے آپ کو بے رنگی کے حوالے نہیں کر دیتا' حیرت مذموم کی منزل پر بھی نہیں پہنچ سکتا اور اس پر بھی اس کو اختیار حاصل نہیں ہوتا" وغیرہ وغیرہ۔ گویا یہ منزل ایک پست درجہ کی تحصیل میں آتا ہے اور اولوالعزم سالکان طریقت اس طرف راغب نہیں ہوتے۔ پھر حضرت غمگین نے اس راستے پر چل کر جو تحصیلات وفتوحات حاصل کیں ان کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے جو یقیناً اپنے موضوعات و مطالب کے لحاظ سے ملفوظات کے نوادرات میں شامل ہونے کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان کے تیسرے خط میں اعیان ممکنات واعیان ثابتہ کی طویل بحث کے ساتھ ہی حضرت غمگین نے اپنی سابقہ وسعت قلب کو برقرار رکھتے ہوئے ایک بہلاوے اور مشفقانہ ترغیب کا رویہ اپنایا ہے اور غالب کے زندگی ہی کے نہیں بلکہ فکری رویوں سے کلیتاً اختلاف کے باوجود کہا ہے کہ "بعض آزادان (بے رنگی) محبت و سکر وفنا کے غلبے میں شراب نوشی بھی کرتے رہے لیکن بعد میں (انہوں نے) مراجعت کی ہے۔ چنانچہ مشفق مجھے بھی آپ کی یہ آزادہ روی بہت اچھی لگتی ہے اور اسی سبب سے آپ سے ملاقات کا خواہش مند بھی ہوں کہ ایسا شہ باز اگر ہمارے جال میں پھنس جائے تو وہ (اپنے طور پر) عنقا سے کم کسی شکار پر مائل نہ ہوگا۔"

لیکن افسوس حضرت غمگین کی ساری ترغیبات اور مشفقانہ اظہارات کے باوجود ان کی یہ خواہشات کہ یہ شہ بازان کے جال میں پھنس کر تقییدات کی راہ اپنائے یک دم فنا ہو گئیں اور وہ اس طرح کہ غالب نے اپنے دسویں خط میں حضرت علیؑ کی خلافت کے بارے میں جن نظریات (یا عقائد) کا پوری تندی اور شدت سے ذکر کیا اور (جس طرح بغیر القاب وآداب کے خط تحریر کیا) اور اس کے جواب مین حضرت غمگین نے جس طرح (چوتھے خط میں) قرآن وحدیث کے حوالوں سے اپنے اظہارات کو محکم بنایا، وہ غالب جیسے آزادہ رو، منفرد مزاج عقلیت پسند کے لیے قابل برداشت نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے یکدم یہ کہہ کر اس مکاتبت کی اعلی اور دل چسپ بساط ہی الٹ دی۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

ایک طرف طریقت کی ہزاروں سال کی رشد و ہدایات کی روشنی میں طے کردہ منزل تھیں ان کی کیفیات و تحصیلات تھیں اور ہر منزل کے اپنے مشاہدات و تجربات تھے اور یہ تمام مشاہدات و تجربات ایک ''راز'' تھے جن کا اخفا ان سالکان طریقت کے لیے لازمی تھا۔ اور ان پابندیوں سے سرمو انحراف بھی ناممکن تھا۔ ان کلمات میں '' جذب'' ہی وہ زادِراہ تھی جس کے بغیر کسی قسم کی تحصیلات کا امکان نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت غمگین غالب کو ہدایت کرتے کہ ان کی رباعیات کی نیہ کو نہ دکھائی جائیں۔ (چنانچہ مکاشفات الاسرار دیوان رباعیات کا نام ہے اور اسی طرح مخزن الاسرار دیوان غزلیات کا)۔ اب دوسری طرف صرف علم و عقل کا ایک پیچ و کار ہے جو ان ساری منزل کو علم و عقل کی روشنی میں طے کرتا اور کرنا چاہتا ہے۔ یہاں '' جذب'' کلیتا ایک ناآشنا چیز ہے۔ گویا باوجود اس کے کہ دونوں کے درمیان شاعری ایک قدر مشترک تھی لیکن یہ قدر اتنی مضبوط نہیں تھی کہ دونوں کو فکری سطح پر طویل عرصے کے لئے یکجا کر سکے۔ دونوں کے رخ مختلف جوانب میں تھے۔ سو یہ اختلاف جلد ہی افتراق میں رونما ہوا لیکن اردو ادب کے لیے ان خطوط کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ غالب اپنے دینی و مذہبی یا نظریاتی لحاظ سے بڑے واشگاف انداز میں اپنے عقیدت مندوں کے سامنے آگئے اور ان کی ذات کے بہت سے زاویے جو آزادہ روی کے جھٹپٹے میں نیم روشن تھے یکسر روشن ہو گئے۔

ادھر جب آپ حضرت غمگین کے خطوط کو دیکھیں تو آپ کو راہِ طریقت کے ان دقیق نکات سے آگاہی ہوتی ہے جو آپ نے کسی دوسرے سالک کی زبان سے نہیں سنے ہوں گے۔ بلکہ موصوف نے عرفان حق کی راہوں کے وہ تجربات بیان کر دیے ہیں جو سلوک کے بنیادی ضابطوں کے خلاف ہونے کے باوجود اپنے قاری کو کسی ریاضت و صعوبت کے بغیر عرفانیات کے روحانی تجربات سے آگاہی فراہم کرتے ہیں۔ اور اس لیے اپنے مطالب و موضوعات کے لحاظ سے ان خطوط کی یہ دوسری بہت بڑی فضیلت ہے۔ اور اسی لیے شائقانِ ادب کے لیے ایک انمول تحفہ بھی۔ اب ان مکتوبات کی

تیسری بڑی فضیلت خصوصیت سے میرے لئے، یہ ہے کہ میرے وسیلے سے بحمداللہ آپ کی خدمت میں پہنچ رہے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ میری یہ کوشش مقبول و معروف ہو۔ آمین۔

اب ایک ضروری بات۔ حضرت غمگینؒ کی شخصیت بوجوہ تاحال عام اردو قاری سے (یعنی علما و متخصصین کے علاوہ) غیر متعارف ہی رہی ہے۔ اس امر کے پیش نظر میں نے مناسب جانا کہ ان کی شخصیت کے دوسرے چند اہم پہلو بھی جو ان پر تازہ مطبوعات کے ذریعے منظر عام پر آئے ہیں اس مجموعے میں شامل کر لیے جائیں۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں چند ضمائم شامل کر لیے گئے ہیں جو ان تراجم کے بعض نکات کے علاوہ حضرت غمگینؒ کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلوؤں پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ اور آخری بات یہ کہ "توضیحات" کے عنوان کے تحت تصوف و فلسفے کی جتنی اصطلاحات کی تشریحات شامل ضمائم ہیں وہ میرے محسن اور دوست محمد الغزالی، پروفیسر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کی توجہ خاص اور ان کے علم متبحر کی مرہونِ منت ہیں۔

غالب کے فارسی خطوط

کا اردو ترجمہ

خط۔۱

قبلہ حاجات، پہلے تو سید امانت علی کے، خدا ان کو سلامت رکھے، دیدار ہی نے دل کو شادمانی سے مالا مال کر دیا اور دوسرے نظر کو بھی روشنی عطا کی۔ چونکہ (وہ) بزم قدسی کے بار پانے والوں میں ہیں، میں ان کے سر کے گرد گھوما اور پھر ان کے کف پا چومے۔ اس فرمان معرفت کے مطالعہ نے کہ جو (جناب کے) گرامی نامہ سے عبارت ہے، روشنی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ سید صاحب اور فقیر صاحب کے ذریعہ ارسال کردہ غزل بھی ملی۔ اس کے ساتھ دوسرا پروانہ لیکر ایک اور شخص بھی آپہو پہنچا، (میں) خوش ہو گیا اور رباعیات کے دیوان کے باعث تو یہ شادمانی اور بھی بڑھ گئی۔ بھلا میرے پاس وہ نقد علم کہاں کہ ان مطالب عالیہ کو سمجھ سکوں اور میں اس لائق کہاں کہ میری خاطر (علم و حکمت کے) یہ موتی رشتہ تحریر میں پروئے جائیں اور اس پر یہ کرم مستزاد کہ (جناب عالی) خود اپنے غلام سے استفسار کریں کہ اگر تو اجازت دے تو دیباچے کو تیرے نام منسوب کر دوں۔ یہ پرسش بجائے خود ایسا انداز کرم ہے کہ زبان کو اس کی سپاس گزاری کی تاب نہیں۔ اے (میرے) مرکز خاطر میں یاوہ گوئی کر رہا ہوں۔ اگر (جناب کا) حکم یہی ہے تو میں (صرف اسقدر) عرض کرونگا کہ اس تحریر میں میرے نام کی شمولیت نہ صرف میرے لیے بلکہ میرے اجداد کے لئے بھی ابدی افتخار کا سرمایہ ہوگی لیکن (یہ ملحوظ رہے کہ) اپنے اس غلام کی تعریف و توصیف اس تحریر میں حد سے زیادہ نہ کی جائے اور (صرف) اپنا کمترین خادم ظاہر کریں کہ بہر طور اس صورت سے بھی (جنابعالی کے) خادموں کا مطلب ادا ہو جائے گا اور مجھ ننگ وجود کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ اس کا منتظر ہوں کہ دیوان رباعیات مجھ تک کب پہنچتا ہے اور میں اس سے کب مستفید ہوتا ہوں۔

حکم (جنابعالی) ہے کہ اس صحیفہ کو غیروں کی آنکھ سے محفوظ رکھوں تو ایسا ہی کرونگا۔ لیکن غیر کہاں ہے؟ اس معروضے کے بعد کہ یقیناً آپ کی مرضی کے خلاف ہرگز نہیں ہوگا، دوسری بات کرتا ہوں کہ جناب کے ذوق اور میرے اعتبار میں اضافہ ہو۔ اس فقیر کے اشعار میں سے ایک شعر جناب

نے انتخاب کر کے اس تحریر میں شامل کیا ہے۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

میں (جناب کا) فرمانبردار ہوں لیکن اس ضمن میں عقل کا فرمان یہ ہے کہ ہر دیکھنے والا ان الفاظ کے دیکھنے سے معنی کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ (لہذا) ہر وہ شخص کہ اس کے معنی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے غیر نہیں ہوا چونکہ اس عالم میں دیر و حرم کی کوئی تفریق نہیں۔ یہ دلچسپ باتیں کہ گستاخانہ عرض کی گئیں ہیں ملحوظ خاطر و ذہن نشین ہوں۔ زیادہ حد ادب، نامہ نگار، اسد اللہ، روز تحریر نامہ، دسویں ذی الحجہ بوقت شام، مشفقی سید حیدر علی صاحب بمطابق اپنے کہنے کے تا حال پہنچ چکے ہوں گے۔ سید جی علی صاحب بھی تہ دل سے سلام کہتے ہیں اور جناب کو بھی مشتاق تصور کرتے ہیں۔

>>☆<<

خط۔۲

قبلہ وکعبہ حضرت پیرومرشد برحق خدا ان کے سائے کو دوام بخشے۔

ستائیسویں محرم جمعہ کے دن شام کے وقت اپنے غم خانے میں اکیلا بیٹھا تھا اور میرے علاوہ اس محفل میں کوئی دوسرا موجود نہ تھا کہ یکا یک معرفت کی بجلی چمکی اور جمعہ نامی قاصد دروازے سے داخل ہوا اور ایک مکتوب کہ جس کو صحیفۂ (مرقعۂ) وحدت کہنا بجا ہوگا میرے حوالے کیا اور مجھے دوبارہ بے خود کر دیا۔ میں نے کہا ہائے افسوس میرے کام میں ایک دوسری گرہ پڑ گئی اور خطرناک مقام آ گیا۔ چونکہ میں نے خود اس پہلے خط کو جو بذریعہ ڈاک مجھے ملا بازوئے فکر کا تعویذ بنالیا ہے اور اس گرمئ گفتار سے پانی میں شکر کی مانند تحلیل ہو چکا ہوں۔ ہر چند چاہیے تو یہ تھا کہ اس مکتوب مقدس کے جواب کیلئے دیدہ و دل کی آمیزش کرتا اور طرح طرح سے معذرت کی بات چھیڑتا لیکن خدا جانتا ہے کہ میں اپنی جسارت پر اس قدر نادم تھا کہ کسی صورت معذرت نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی اس فرمانِ سعید کا کوئی جواب ہی بن آتا تھا۔ اس بار کہ دوسرا خط بھی آ پہنچا تو اس شرمساری پر بے قراری کا اور اضافہ ہو گیا اور چاروناچار مجھے بات کرنے پر مجبور کر دیا۔ ہائے ہائے اس عبودیت نامے میں کہ جس میں میں نے یاوہ گوئی اور سرکشی کرتے ہوئے ''عین'' اور ''غیر'' کی بات کی ہے، ابتدائے سخن سے پیشتر ہی اپنی گستاخی کی معذرت چاہی ہے اور عرض کیا ہے کہ غیر کہاں ہے کہ الفاظ ایک لطیفہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ورنہ بات وہی ہے جو آپ سمجھتے ہیں اور میں بھی وہی رائے رکھتا ہوں۔ خدا کی قسم (جناب کے) قلم ہدایت رقم نے ان دو مکاتیب میں جو کچھ بھی تحریر فرمایا ہے بجا، برحق و محمود ہے۔ ور اس تنگِ وجود کی رائے بھی اس سے مختلف نہیں لیکن اب کیا کروں کہ وقت نکل چکا ہے اور بات غیر ارادی طور پر منہ سے باہر آ چکی ہے۔

یقیناً یہ پیر و مرشد کا ذوقِ التفات اور شوقِ آمد دیوانِ رباعیات ہی تھا کہ جس نے مجھے اپنی جگہ بلا ڈالا اور ایسا بے خود کر دیا اور اس بے خودی ہی میں میرے منہ سے وہ بات نکل گئی۔ ان ساری باتوں کے باوجود آپ سے ہرگز یہ پوشیدہ نہ ہوگا کہ وہ بات نہ بطور دعویٰ تھی اور نہ ہی باندازِ سرکشی۔

میں تو یہ جانتا تھا کہ اس لطیفے سے ذوقِ (سخن) ابھرے (لیکن) اس نے الٹا مجھے دامِ اضطراب میں ڈال دیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ع یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ منزل دور شد

ترجمہ: ع میں ایک لحظہ غافل ہوا اور اپنی منزل سے ایک صدی (کے برابر) دوری ہوگئی۔

میں دکھ کی آگ میں اس لیے جل رہا ہوں کہ جبکہ پہلا خط خصوصاً ارشاد وہدایت کے مضمون پر مبنی تھا دوسرا خط ناراضی کی خبر دے رہا ہے اور میں ناتوانی کے سبب برداشت کی طاقت نہیں رکھتا جس طرح کہ شاعر نے کہا ہے۔

ے ماتنک ظرفاں حریف ایں قدر سختی نہ ایم
دانۂ اشکیم مارا گردشِ چشم آسیاست

ترجمہ: ہم کم ظرف لوگ زیادہ سختی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم تو دانۂ اشک ہیں آنکھیں پھیرنا ہی ہمارے لیے چکی (میں پسنے) کے مترادف ہے۔

(دیوانِ) رباعیات کے ارسال نہ کرنے کا شہرہ تو ''دورباش'' کی وہ پکار ہے جو دل کو خون اور روح کو فرسودہ کئے دیتی ہے۔ مجھے اپنی جان وایمان کی قسم، اس روز سے کہ آپ کا وعدہ گرامی خاطر نشین ہے، کونسا دن ہے کہ (میں) دیوانِ رباعیات کے پہنچنے کا انتظار نہیں کرتا اور دل کو اس خیال سے نہیں بہلاتا اور کون شخص ہے جو نہ جانتا ہو کہ امیدواری کے بعد ناامیدی کس قدر جانسوز ہوتی ہے۔ مجبوراً اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ حقیر تصور کرتے ہوئے دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ چونکہ جنابعالی رباعیات کا مسودہ تیار کر چکے ہیں، لازمی اب آپ کو کوئی شخص چاہیے کہ اس کی نقل کر سکے اور وہ شخص کہ یہ کام کر سکے چاہیے کہ خوش خط ہو اور درست لکھ سکے چونکہ میرا خط بھی بُرا نہیں اور ہوسکتا ہے کہ (میں) دوسروں کے مقابلے میں زیادہ صحیح لکھ سکوں، امید اس امر کی رکھتا ہوں کہ یہ خدمت میرے سپرد کردی جائے اور (مسودہ کے) وہ اجزا مجھے بھیج دیے جائیں کہ ان کو نقل کر کے (جناب کی) خدمت میں ارسال کردوں اور اپنے اوپر احسان کروں۔ اس ہی خط میں یہ بھی تحریر ہے کہ فراست وذکاوت میں تم تفضّل حسین خان کے مرتبے پر پہنچ گئے ہو۔ تو اس ضمن میں یہ عرض ہے

کہ تفضل حسین خان ایک شخص تھا، مختلف علوم کا ماہر طب ونجوم وہیئت وہندسہ کا فاضل تھا اور ہر قسم کے علم (کے موضوع) پر بات کر سکتا تھا۔ بھلا میں یہ مختل ناقص فارسی جانتا ہوں اس کے مرتبے پر کس طرح پہنچ سکتا ہوں۔ مجھے اپنی غزل کا ایک مطلع اور حسن مطلع یاد آگیا ہے اس کو مقام کی مناسبت کے مطابق اس خط میں تحریر کر رہا ہوں۔

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو
کافر نہ توانی شد ناچار مسلماں شو

ترجمہ: نیک بختی وکامرانی سے کبھی بھول چوک نہیں ہوتی۔ (لہٰذا اس ضمن میں) تو اپنی مساعی پر خود ہی نادم ہو جا۔ (اور چونکہ) کافر ہونے کی تجھ میں صلاحیت نہیں ناچار مسلمان ہو جا۔

؎ زیں ہرزہ رواں گشتن قلزم نتوانی * گشت
جوئی بہ خیاباں رو سیلی بہ بیاباں شو

ترجمہ: اس آوارہ گردی سے تو قلزم تو بن نہیں سکتا۔ سو اگر تو ایک نہر ہے تو خیابان میں بہہ اور اگر سیلاب ہے تو بیاباں کی راہ لے۔

قبلہ وکعبہ خدا نہ کرے کہ کبھی یہ حقیقت میری نظر سے اوجھل ہو کہ میں حقیر لوگوں میں سے ہوں اور وہ ننگ دخار ہوں جس کی کوئی قیمت نہ ہو اور جو کسی کام نہ آئے۔ اسلام کو مجھ سے شرم اور کفر کو مجھ سے عار آئے۔ جس طرح کہ شاعر کہتا ہے۔

؎ براہ اوچہ دربازیم نے دینے نہ دنیائے
دلے داریم و اندو ہے سرے داریم و سودائے

ترجمہ: ہم کس چیز کو داؤ پر لگائیں کہ (ہمارے پاس تو) نہ دین ہے اور نہ دنیا۔ ہمارے پاس تو ایک دل ہے اور اس ہی کا ہمیں غم ہے اور ایک سر ہے اور (اس ہی کے سبب) ایک سودا۔

نہ خرد روشن، نہ عقل درست، نہ بخت سعید۔ میں تو صرف اس بات کو جانتا ہوں کہ (قدرت نے) مجھے بے رنگی پر رجھا کر تھوڑا بے خود کر دیا ہے۔ "صورت پرستوں" کے عقیدہ کے مطابق مجھے

انقسام وجود پر یقین نہیں۔ وہ اس لیے کہ وجود ایک اکائی ہے اور ہرگز تقسیم نہیں ہوسکتی نہ ہی تغیر و تبدّل اس میں راہ پا سکتا ہے اور وجود کے مقابل صرف عدم ہی ہو سکتا ہے۔

عقل در اثبات وحدت خیرہ می گردد چرا

ہر چہ جز ہستی ست ہیچ و ہرچہ جز حق باطل است

ترجمہ: عقل وحدت کے اثبات میں کیوں چندھیانے لگتی ہے! ہستی کے سوا ہر چیز ہیچ ہے اور حق کے سوا باقی سب، باطل ہے۔

ماہمہ عینِ خودیم اما خود از وہمِ دوئی

درمیانِ ما و غالبؔ ما و غالبؔ حائل است

ترجمہ: ہم اپنے آپ کا ''عین'' ہیں لیکن دوئی کے وہم کے سبب ہمارے اور غالبؔ کے درمیان ہم اور غالبؔ آپڑے ہیں۔

غرضیکہ ہر قسم کے ذکر و فکر و (جذبہٗ) اشتیاق کے بعد اس خاکسار کے دل کو تو حضرت محی الدین ابن عربی کے ایک فقرہ نے موہ لیا ہے اور وہ ہے ''الحق محسوس'' و ''الحق معقول'' اور مخلوق عالم زمین سے آسمان تک (ہے) اور احدیت کی کیفیت کے علاوہ جو بھی تصور کریں وہ سارا کا سارا تعلق محض ہے۔ اس نکتہ کو بیدلؔ نے کیا عمدہ بیان کیا ہے۔

ما خیالات عالم غیبیم گفتگوئے جہانِ لاریبیم

ترجمہ: ہم عالم غیب کے خیالات ہیں۔ (اور) جہان لاریب کی گفتگو ہیں۔

کثرت آمد دلیل یکتائی کہ خیالِ وراست تنہائی

ترجمہ: کثرت (ہی) احدیت کی دلیل ہے چونکہ خیل ماسوا تنہائی ہے۔

اس خادم کا تو یہی ایمان ہے اور اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ وہم و وسواس ہے اور اس عالم کی نبوت، ولایت، حشر نشر، عذاب ثواب، جو کچھ بھی گنائیں سب برحق ہے اور ان سب پر خادم کا ایمان پختہ ہے۔ سبحان اللہ جنابعالی ہی کی کہ عارف حق ہیں، توجہِ قلبی کے اثر سے جناب سید الشہد احضرت

امام حسین علیہ السلام کا یہ اعجاز نما کلمہ غیر ارادی طور پر یاد آ گیا۔ حضرت فرماتے ہیں۔ ماشامت الاعیان رائحہ الوجود۔ یعنی اعیانِ ثابتہ نے وجود کی خوشبو نہیں سونگھی ہے۔ ایک دو اپنے کہے ہوئے اشعار میں سے تحریر کرتا ہوں۔

چوں پردۂ شب باز مصور بخیال است
ایں کار گہِ وہم زپیدائی اشیا

ترجمہ: یہ کارخانہ وہم وگماں کہ اشیا کی نمود پر مبنی ہے اس طرح ہے جیسے کسی شب بیدار تماشا گر کا خیال ہو۔

؎ اندیشہ دو صد گل کدہ گل بردہ بہ دامن
امّا ہمہ از نقش و نگار پرِ عنقا

ترجمہ: فکر نے دوسو گلستانوں کے پھول اپنے دامن میں بھر لئے لیکن یہ سارے پھول پرِ عنقا کے نقش ونگار سے عبارت تھے۔

؎ آئینہ بہ پیشِ نظر و جلوہ فراواں
دل پُر ہوس و صاحبِ خلوت کدہ تنہا

ترجمہ: آئینہ نظر کے سامنے ہے اور جلووں کی فراوانی ہے۔ دل پر ہوس مسلط ہے اور خواجہ خلوت تنہا ہے۔

ہر چند کہ آپ جیسے مرشدِ قدسی صفات کے سامنے ان امور کا بیان دریا کو ایک گھڑا اور گلستان کو ایک برگ گل لے جانے کے مصداق ہے لیکن اس دردمند کا مقصود اپنے عقیدہ کا اظہار ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ اس عقیدے سے کسی چیز کی نفی نہیں ہوتی بلکہ وہ سب کو کیفیت واحد میں قبول کرتا ہے، وہ کفر ہو کہ اسلام یا اس کے علاوہ ہمہ یعنی کُل تصور کے طور پر موجود ہے لیکن وہ تصور نہیں جو ہم نے کر رکھا ہے بلکہ اس تصور سے وہ تصور مراد ہے کہ جو کیفیت واحد کیلئے مخصوص ہے اور اس مقام پر دریا و موج اور آفتاب ونور کی تشبیہ انتہائی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ میر صاحب مشفق سید امانت علی صاحب کہ جنابعالی کے تربیت یافتگان میں سے ہیں اکثر رات کو مجھ پر نوازش کرتے ہیں اور جب

خلوت میسر آتی ہے تو راز کی باتیں ہوتی ہیں۔ دو تین دن ہوئے ہوں گے کہ بات بے رنگی کے دائرہ میں جا پہنچی۔ یہ روسیاہ چونکہ ان دنوں بے رنگی (ہی) کے نظارے میں مبتلا ہے میں نے اس باب میں مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا کہ اس سے بلند اور کوئی درجہ نہیں۔ میر سید امانت علی صاحب نے فرمایا کہ اس درجے کا ادراک بھی ایک درجہ ہے۔ میں نے کہا تسلیم۔ لیکن یہ کہنے کی بات نہیں۔ یہ ایک امر ہے کہ افراطِ استغراق میں خود بخود حاصل ہو جاتا ہے اور اس درجہ کے حصول کا طریقہ وہی مشاہدہ بے رنگی میں عمدگی توجہ ہے، نہ یہ کہ اس کی خاطر (اس کے مشاہدہ سے) قطعِ نظر کر لیں۔ ورنہ دوسری صورت میں تو یہ عام لوگوں کی روش کا اتباع ہو جائے گا جہاں لوگوں کے گروہ اس سے غافل ہیں جبکہ لوگوں کی اس کیفیت سے غفلت ان کو اس زبانی کیفیت کے وجد تک نہیں پہنچاتی۔ ع کوئی سمجھے تب ہمہ اوست اور نہ سمجھے تب بھی ہمہ اوست۔

خدارا اس نکتہ پر توجہ فرمائیں اور اس قدر ارتکازِ نظر ارزانی کریں کہ اس عقیدت مند کی مساعی فکر بے رنگی کی منزل سے آگے بڑھ جائیں تا کہ رفتہ رفتہ معدوم و مستغرق ہو جاؤں اور (اس طرح) رنگ سے بے رنگی و استہلاک میں مستغرق ہو کر معدوم محض ہو جاؤں۔ چونکہ جنابعالی نے رباعیات کے نہ بھیجنے پر جائز سرزنش فرمائی (تھی)، ناچار حیرت زدہ ہو کر میں نے بھی اپنے دل کی ساری پریشان خیالی بیان کر دی۔ اگر میرا جرم قابلِ معافی ہے تو مجھے میری خطا کی معافی کی خوش خبری سے نوازیں کہ از سر نو مسلمان ہو جاؤں اور رحمت حق پر تجدید ایمان کروں۔ اللہ بس ماسوا ہوس۔

تحریر کردہ اٹھائیسویں محرم (1255ھ 1841ء) بروز ہفتہ بوقت چاشت۔ منجانب اسد اللہ روسیاہ۔ میر صاحب مشفق سید حیدر علی صاحب سلام کہتے ہیں اور بعد اظہار عجز و انکسار بحضور پیرو مرشد فرماتے ہیں کہ میری خطا بخش دی جائے۔ فقط

.... <<☆>> ... ...

خط۔۳

حضرت پیر و مرشد برحق (آپ کو خدا) سلامت (رکھے)۔ طالع یار خان صاحب کے پہنچنے کے بعد میں نے ایک عریضہ بتاریخ چودہ ربیع الاول بروز منگل انگریزی ڈاک سے روانہ کیا اور میجر جان جاکوب صاحب کے نام کا خط بھی   جمعہ کے دن سترہ ربیع الاول کو جناب کا مکتوب گرامی اور آں جناب کا فرمان ہدایت پہنچا اور مجھے عزت بخشی۔ رباعی کے مضمون کی تازگی نے مجھے بے خود کر دیا۔ خدا کی قسم کسی شاعر کا خیال اس نکتہ تک نہیں پہنچا اور کسی کی اس مضمون تک رسائی نہیں ہوئی۔ زاہدوں کی پیشانی کے داغ کو نیلے قشقہ سے تشبیہ دینا پاکیزہ و تازہ و دلکش (خیال) ہے۔

کر ظن نہ کچھ اس شراب رمانی پر
مت کبر کر اپنے زہد نفسانی پر
گر کفر دوئی نہیں تجھے اے زاہد
قشقہ یہ کبود کیوں ہے پیشانی پر

لیکن ان جملوں نے کہ ''ہم نے تو پیار و محبت لکھا اور تم نے کو عتاب سمجھے۔ تمہیں مجھ سے کوئی دینی غرض ہے ور نہ دنیوی۔ تو پھر میں عتاب کیوں کروں۔ فقط''۔ دل کو افسردہ اور مجھے ناامید کر دیا اور چار و ناچار مجھے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ بات کو طوالت دی جائے اور جو کچھ کہ دل میں ہے (کھل کر) کہہ ڈالوں۔ قبلہ و کعبہ، راستی میرا مسلک ہے اور محبت میرا دین۔ راستی کو ایمان اور جھوٹ کو کفر تصور کرتا ہوں اور اس بیان پر خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ جناب عالی سے میری عقیدت و محبت ناقابل بیان ہے۔ جناب کی مجھ سے ناراضی کا خیال بھی کبھی نہیں آیا اور نہ ہی میں نے کبھی آپ سے شکایتاً کوئی بات کی ہے لیکن اتفاقاً لفظ عتاب زبان پر آ گیا ہے۔ (دراصل) عتاب سے میرا مقصد عنایت تھا چونکہ کوئی شخص کسی غیر سے ناراض نہیں ہوتا اور تاوقتیکہ اس کو اپنا نہ جانے خفگی نہیں کرتا۔ جناب عالی تو مجھ سے کبھی ناراض نہیں ہوئے اور میں تو ان لوگوں میں سے ہوں کہ اگر بفرض محال آپ مجھ سے ناراض بھی ہوں تو میں اس قدر ناز و فخر کروں کہ کوئی دوسرا عنایت پر نہ کرے۔ یہ اس لیے کہ

عتاب و عنایت دونوں محبت کا نتیجہ ہیں اور محبت پیشہ لوگوں پر دونوں صورتوں میں شکرانہ محبت لازم ہے۔ البتہ آپ نے دینی اور دنیوی اغراض کی جو بات کی ہے تو خدا کا شکر ہے کہ اس عاجز کا قرطاس خاطر ان دونوں نقوش سے پاک ہے۔ محبت کے سوا نہ میرا کوئی دین ہے اور نہ دنیا۔ باوجود اس کے کہ میں ایک حقیر، بے حیثیت اور نادان انسان ہوں لیکن اس قدر ضرور سمجھتا ہوں کہ وجود صرف ایک وحدت ہے اور اس کی تقسیم ناممکن ہے۔ بے شک اگر کوئی دین اور دنیا بنا بھی لوں تو شرک الوجود کا مرتکب ٹھہروں گا جو انواعِ شرک میں بدترین ہے۔ اس مکتوب نگار کی فہم کے مطابق دین بھی دنیا کی طرح ایک نقش موہوم (ہے) اور (ظاہر ہے) کہ وہم پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

ے زاہدا ساماں پرستاں راضی اند از ما کہ ما

خود شریکِ ہیچ کس در ہر دو عالم نیستیم

ترجمہ: اے زاہد، ظاہر پرست ہم سے اس بات پر متفق ہیں کہ ہم دونوں عالم میں سے کسی کے شریک نہیں ہیں۔

ے دشمنی خیزد ز شرکت، تا بہ قصدِ دوستی

عاقبت گم کردہ و دنیا طلب ہم نیستیم

ترجمہ: دشمنی تو شرکت سے پیدا ہوتی ہے کہ دوستی کے ارادے میں ہماری عاقبت بھی ہاتھ سے جاتی ہے اور ہم دنیا طلب بھی نہیں ہیں۔

دین طلبوں کو دین مبارک اور دنیا پرستوں کو دنیا نصیب ہو۔ ہم ہیں اور دنیا و عاقبت کی روسیاہی کہ نیستی محض سے عبارت ہے۔ جو کچھ جناب کے قلمِ مشکین رقم نے "ماشامت الاعیان رائحتہ الوجود" کے ضمن میں تحریر کیا ہے (کہ) حق حق، عینِ حق اور محض حق ہے (تو اس بارے میں) جناب کے خاک پا کی قسم کھا کر (عرض کرتا ہوں کہ) اس روسیاہ کا عقیدہ بھی اس کے خلاف ہے یہ میں نے غلط لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعیان ثابتہ خالق کی خلق پر موقوف نہیں۔ اعیانِ ثابتہ کا وجودِ مطلق کے ساتھ ہی تعلق ہے، جو خطوط شعاع کا آفتاب کے ساتھ اور نقوشِ امواج کا دریا کے ساتھ۔ بے

شک (چونکہ) وجود واحد ہے (اس لیے) وجودِ اعیان ثابتہ بھی محض وجود واجب ہے یعنی حق تعالیٰ جل شانہ۔ اور یہ جو امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اعیانِ (ثابتہ) نے بوئے وجود نہیں سونگھی ہے تو وجود، ہستیِ موہوم سے عبارت ہے یعنی پیدائی ونمائش۔ اور یہ تو مسلمہ (حقیقت) ہے کہ واجب پر تغیر روا نہیں۔ پس اس سے امام کا مقصود یہ ہے کہ اعیانِ ثابتہ کبھی بھی نمائش وہی نہیں اعتباری ہیں۔ اعیانِ ثابتہ سے لے کر صورِ محشر تک جو مظاہر ومناظر ہیں مستند طور پر باطل ہیں اور ان میں (حقیقتاً) کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی بلکہ یہ ایک ہی حالت میں ہیں۔ مثلاً اجزائے آفرینش میں سے ایک جز (یعنی) ایک شخص کو دیکھتے ہیں کہ پشت پدر سے شکم مادر میں پہنچا اور نو ماہ بعد زمین پر وارد ہوا اور چند سال دودھ پیا، پھر بولنا شروع کیا اور ہر قسم کی باتیں کیں اور زید نام پایا۔ جب جوان ہوا تو دانشوری کی شہرت پائی، علم سیکھا، لوگوں کو راہِ راست دکھائی اور ستر سال اس طرح زندگانی کی، بالآخر بیمار ہوا اور مر گیا اور لوگوں نے اس کو دفن کر کے اس کے مزار پر ایک بلند گنبد کھڑا کر دیا اور اب اس کی زیارت کرتے ہیں اور ہر شخص جو مانگتا ہے اس مزار سے پاتا ہے۔ غرضیکہ یہ یہ ساری اور ہزارہا اسی قسم کی باتیں جو تصور کی جاسکتی ہیں اور جو ہم کہتے ہیں۔ یہ سارے تو ہمات ظاہر ایکسر بے بنیاد ہیں۔ نطفہ کی پیوستگی کے دن سے دفن کئے جانے تک وہی عینِ ثابتہ زید ہے کہ جو وجود مطلق میں ثابت ہے (جس نے) قطعاً نہ نمائش قبول کی اور نہ ہی فنا پذیر ہوا۔ (اور آئندہ بھی) نہ ظاہر ہوگا اور نہ پنہاں رہے گا اور یہ پیدا ہونا، رہنا، بولنا، سننا، زندہ رہنا اور مرنا یہ سب زید کی عین ثابتہ کی حقیقت ہے جو ہمیشہ سے اس میں موجود ہے اور رہے گی اور یہ مثال جو دی گئی صرف نوعِ بشر پر ہی منطبق نہیں ہوتی بلکہ ستاروں، آسمانوں، عرش، کرسی، شجر، حجر حتیٰ کہ زمان ومکان کا بھی یہی حال ہے۔ (درحقیقت) آسمان نہیں، یہ فلک کا عین ثابتہ ہے اپنی حقیقت گردش اور ذات واحد الوجود میں (اپنے) ارتکاز کے ساتھ۔ یہ آفتاب نہیں، آفتاب کا عینِ ثابتہ ہے جو اپنی تمام چمک دمک کے ساتھ ذات احدی میں جلوہ گر ہے۔ وقت نہیں ہے بلکہ عینِ ثابتۂ وقت ہے مکان کی صورت اور یہ اس ہی کے اعتبارات ہیں جو آج اور کل کی صورت میں وجودِ مطلق میں شامل ہیں (جبکہ) ازل سے ابد تک

ایک ہی لحۂ واحد ہے اور تحت الثریٰ سے لے کر عرش کی بلندی تک وہی ایک مکانِ واحد ہے اور ذات واجب کا ثبوت بدیہی بھی ہے اور حقیقی بھی لیکن چونکہ ذات واجب تغیر وتبدل سے مصئون محفوظ ہے اس لئے لازماً اعیان ثابتہ بھی نمود وہمی میں وجود پذیر نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کو زوال لا حق ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ اعیان ثابتہ کا موجود نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ تغیر پذیر نہیں ہیں اور ذات (احدیت) سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے اور ہمیشہ اپنے آپ سے اپنے آپ پر روشن ہوتے ہیں۔ جب حقیقت یہ ہے تو کیا ضرورت ہے کہ اعیان کو ممکنات کے معنی میں شمار کریں۔ دراصل اعیان سے اعیانِ ثابتہ ہی مراد ہوتے ہیں اور وجود سے مراد نمائش، محال پسندی، تبدل اور تنزل ہوتا ہے اور اگر وجود سے وجود مطلق مراد لیں تو البتہ اس صورت میں اعیان کو ممکنت ہی کے معنی میں سمجھ سکیں گے اور (ان کو) ہرگز اعیانِ ثابتہ نہیں کہیں گے چونکہ اس صورت میں انکارِ وجودِ واجب لازم ہو جاتا ہے۔ خدا اس عقیدے سے محفوظ رکھے۔ اب جو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے تو بہتر ہے کہ میں مشاہدۂ بے رنگی کے ضمن میں بھی اپنا حال عرض کردوں کہ کاندھوں کا بوجھ ذرا ہلکا ہو جائے۔ اے خداوند میں نے ہوس سے آنکھیں موندلی ہیں اور بے رنگی سے دل لگا لیا۔ (اور اب) یہی بحث اعیان ثابتہ کہ جس پر گفتگو ہوئی مطمح نظر ہے اور یہی میری کوشش ہے کہ اپنی عین عدمیت پر لوٹ جاؤں اور جلد سے جلد (اپنے مقصود) کو پالوں (لیکن) بغیر ریاضت کے۔

ع دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست

ترجمہ: جانو تب ہمہ اوست اور نہ جانو ہمہ اوست

البتہ فی الوقت یہ کیفیت ہے کہ میرا وہم تھوڑا باقی ہے جو کبھی کبھی مجھے گمراہ کرتا ہے لیکن اس نگاہِ کرم کی برکت کے سبب کہ جو پیرو مرشد مجھ پر رکھتے ہیں امید رکھتا ہوں کہ ان وسوسوں سے پاک ہو جاؤں گا اور راہ فنا میں خاک ہو جاؤں گا۔ قبلہ وکعبہ حقِ گزارش تحریراً ادا نہیں ہو سکتا اور تحریر تقریر کا مرتبہ نہیں حاصل کر سکتی۔ اس دن کا آرزومند ہوں جب جنابعالی کی قدم بوسی سے مشرف ہوں گا اور اپنے دردِ دل کو زبان سے بیان کروں گا اور جناب کا ارشاد اپنے گوشِ ہوش سے سماعت

کروں گا۔

یہ جو آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تصوف کے باب میں بھی تیری جانب سے پورا اطمینان حاصل ہو گیا تو (عرض یہ ہے کہ) جناب عالی میں سپاہی بچہ، بے علم و بے سواد (ہوں)۔ میرے باپ دادا صحرا نشین ترکوں میں سے تھے۔ بس اتنا ہے کہ میں ایک دو مصرعے موزوں کر لیتا ہوں اور ہر صنف میں کچھ نغز گوئی کر لیتا ہوں۔ مجھے تصوف سے کیا واسطہ اور درویشی سے میرا کیا رشتہ لیکن فی الوقت اس سے زیادہ (ہرگز) نہیں کہ واحدیت وجود اور عدمیت اشیا کو (مشیت نے) میرے ضمیر میں ڈال دیا ہو اور الحق محسوسٌ والحق معقولٌ کو میرا عقیدہ بنا دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہی یکتا ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ دوسرے میری حوصلہ مندی، کوشش، ریاضت، دولت و مال سب کا انحصار ایک دو پیمانہ ہائے شراب پر ہے کہ رات کو پی لیتا ہوں اور مست (ہوکر) سو جاتا ہوں۔ (اس سے زیادہ) میں نہ دین کو سمجھتا ہوں نہ دنیا کو۔ اللہ بس ماسوا ہوس۔ خداوند نعمت خدا آپ کو سلامت رکھے۔ گرمیاں میرے عزم سفر میں مانع نہیں، کام نہ ہونا بھی مانع نہیں خرقہ جسم پر ڈالوں گا اور روانہ ہو جاؤں گا لیکن میرا مقدمہ ولایت گیا ہوا ہے اور پورے دو سال ہو چکے ہیں تو اس کی امید لگی رہتی ہے کہ آج یا کل یا پھر زیادہ سے زیادہ ہفتے بعد، دو ہفتے، ایک ماہ، دو ماہ بعد ولایت سے اس کا فیصلہ پہنچ جائے گا۔ اور پھر اسکے پہنچنے کی دیر نہ ہوگی کہ میں گوالیار روانہ ہو جاؤں گا۔ پیر و مرشد خریدے ہوئے غلام کو آزاد نہیں کریں گے چونکہ وفادار ہے۔ اس سے زیادہ کیا کہوں کہ کہنے کے لائق ہو۔

منجانب اسد اللہ۔ محررہ 18 ربیع الاول (1255)، بروز ہفتہ بوقت نیم روز

>>☆<<

خط۔۴

در دل ز تمنائے قدمبوس تو شو ریست

شوقت چہ نمک دادہ مذاق ادبم را

ترجمہ: میرے دل میں تیری قدمبوسی کے سبب ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ تیرے شوق نے میرے ذوق ادب کو کیسا نمک چکھادیا ہے۔

قبلہ راستاں کے قدموں پر اپنی جان نچھاور کرنے کا خیال آتا ہے۔ اگر گستاخی نہ ہو تو قبلہ سالکاں کے گرد سر پھرنے کی آرزو کروں۔ اگر ادب اجازت دے (تو) دلکش خطوط کا درود اور محبت آمیز نکات کی سماعت کہ جو مجھے اپنی خوش بختی کی امید دلاتی ہے، مجھے بیش سے بیشتر مبارک ہوں چونکہ جناب عالی نے اپنے قلب ونظر میں مجھے جگہ دی ہے اگر اس عروج پسندی پر میرا سر آسمان سے جا لگے تو بجا ہے اور اگر اس خودنمائی میں مجھے اپنے سوا کوئی دوسرا نظر نہ آئے تو جائز۔ اس دریائے کرم وسخاوت کی نوازشات کے شمار میں طالع یار خان مجھ سے بڑھ گئے ہیں اور میری عقیدت میں ناقابل حساب اضافہ کر دیا ہے۔ بھلا میں اس التفات کے لائق کہاں اور نکوکاری میں میرا وہ مرتبہ کہاں کہ کوئی میری تعریف کرے اور میرے دیدار کا تمنائی ہو اور وہ بھی ایسا اعلیٰ مرتبہ اور بلند پایہ شخص کہ جس کی فصرت سات سمندروں کی آبرو ہو اور جس کا پھول آٹھ گلستانوں کیلئے رنگ وبو۔ شبلی ماسوائے اللہ کے سارے قطع تعلق کے باوجود عبادت گاہ میں اس کے قدموں کی تمنا میں چشم براہ ہے اور منصور اس انا الحق کی پکار کے شوروغوغا میں اس کی بات سننے کی آرزو میں گوش برآواز ہے۔ سبحان اللہ۔ وہ (شخص) کہ جس کی شمعِ جمال کی پروانگی پر تجلی طور بھی فخر کرتی ہے، مجھ سے طلبِ جلوہ کر رہا ہے اور وہ کہ کوئی نظر جس کے نظارے کی تاب نہیں رکھتی میرے دیدار کی طالب ہے۔ کیا کروں ایک طویل مدت سے میری ہمت ایک مہم میں الجھی ہوئی ہے اور ایک مقصد کے ذوق کی تب وتاب نے میرے پیراہن میں چنگاری ڈال رکھی ہے اور وہ بذات خود (ایک) نازک کام ہے اور دشوار مقصد ہے کہ جو اس سے پہلے کئی سال سے ریزیڈنسی دہلی میں کش مکش میں ہے اور ایک طویل مدت سے کلکتہ کی کونسل

آف گورنر میں پڑا پیچ وتاب کھا رہا ہے۔ اب دو سال ہوئے ہیں کہ وہ مقدمہ ملک لندن گیا ہے اور وہاں عدالت میں زیر غور ہے۔ جب تک کہ اس ملک سے کوئی جواب اور اس عدالت سے کوئی حکم نامہ نہیں آ جاتا، اس جگہ سے حرکت کرنا اور دہلی سے باہر جانا ممکن نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس مقدمے کے بارے میں کچھ احوال جناب کی خدمت میں پہنچاتا لیکن اگر میں اس میں لگ جاتا تو طوالت کے سبب موضوع سخن ہی کھو جاتا اور گوہرِ مقصود بھی سامع کے ہاتھ نہ آتا۔ قصہ مختصر منتظر بھی ہوں اور مطمئن بھی (لیکن) اس کشمکش میں کہ جس کے سبب اندر اور باہر سے انتشار کا شکار ہوں، سفر کا یارا نہیں۔ لیکن سمجھتا ہوں کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو آئیں اور مقصد کی گرہ کھلنے ہی والی ہے ارادہ یہ ہے اور اس بات کو پوری طور پر سمجھتا بھی ہوں کہ جب ولایت سے نزاع کے اختتام کا حکم آ جائے گا تو اس کے بعد سوائے اس تھوڑے وقت کے کہ جو ضرورت سفر میں لگے (مزید) دہلی میں نہیں ٹھہروں گا اور (سیدھا) عازم گوالیار ہو جاؤں گا۔ اگر چلنے والے پیروں سے چلتے ہیں میں سر کے بل چلوں گا۔ امیدوار ہوں کہ جناب عالی اپنے پرورش یافتگاں اور خوانِ فیض کے پارہ چینوں کو ہدایت فرمائیں گے کہ خاص وقت پر مجھے اور میرے کام کو خیال میں لا کر اس پر توجہ فرمائیں کہ میرا کام جلد ہی ہو جائے اور میری آرزو برآئے کہ میرے پائے راہ پیما کو کشادگی نصیب ہو اور میں گوالیار کا راستہ پکڑوں۔

پوشیدہ نہ رہے کہ طالع یار خان کے پہنچنے کے تین دن بعد جناب کا حکم نامہ کہ سراسر رنگ دبیرگی کی تحریر سے پُر تھا، مجھے بذریعہ ڈاک ملا اور (وہ) میری ہمت کے بازو کا تعویذ بن گیا ہے۔ اسی طرح مجھے یہ امید بھی ہے کہ اس عرض داشت کے پہنچنے سے چند دن پہلے ہی سید امانت علی صاحب حاضر ہو کر آپ کی درگاہِ قبول میں میرا سلام نیاز اور نظرِ کرم میں فارسی کی غزلیں پہنچا چکے ہوں گے۔ اس تھوڑے عرصے میں میجر صاحب کرم فرما میجر جان جاکوب صاحب بہادر دو خطوط دولت خانے کی تعمیر کی تاریخ کی طلبی کیلئے مجھے ارسال کر چکے ہیں۔ ان دونوں خطوط کے جواب میں ایک خط کہ جو دو قطعات تاریخ پر مشتمل ہے اس معافی نامے کے ساتھ ہی ارسال کر رہا ہوں۔ مطالعہ کے بعد مکتوب الیہ کو دے دیا جائے۔ زیادہ حد ادب، از اسد اللہ۔ محررہ چودھویں ربیع الاول 1255ھ۔ میں حیدر علی

صاحب اور میر امانت علی صاحب کی خدمت میں سلامِ نیاز پہنچے۔ مکرمی حکیم رضی الدین حسن خان صاحب کہ جو مجھے لطف و کرم سے نوازتے ہیں اور جن کی ملاقات ہی اس دکھ میں میری خوشی (کا سامان) ہے سلام، نیاز کہتے ہیں اور میری طرح ہی دیدار کے متمنی ہیں۔

>>☆<<

خط ۔ ۵

جناب باری خدا آپ کو سلامت رکھے۔ سترہ ربیع الاول کو جمعہ کے بعد ایک قاصد دروازے سے داخل ہوا اور (جناب کا) گرامی نامہ مجھے دیا۔ جب اس سے پوچھ گیا کہ تو کون ہے اور کب جا رہا ہے تو بتایا کہ نواب شاہ جی کے نوکروں مین رہا ہوں اور دو تین دن میں گولیار جا رہا ہوں۔ خاکسار نے دوسرے دن کہ ہفتے کا دن اور ربیع الاول کی اٹھارہ تاریخ تھی خط لکھنے کو (ا) قلم سنبھالا اور اس مکتوب میں درد دل بیان کیا۔ آج تک کہ اتور کا دن اور مہینہ کی ستائیس تاریخ ہے وہ خط میرے پاس جوں کا توں دھرا ہے لیکن نامہ بر غائب ہے۔ اس وقت تک کہ دن کا ایک پہر باقی ہے انگریزی ڈاک کے محکمہ کا ایک ہرکارہ اتفاقاً آ پہنچا اور جناب کا حکمنامہ اور جان صاحب کا خط کہ دونوں تیئیس تاریخ کے لکھے ہوئے تھے مجھے دکھائے۔ یقیناً دونوں خط دونوں جگہوں سے اس ہی خط کے جواب میں تھے جس میں قطعہ تاریخ لکھا گیا تھا۔ قصہ مختصر اس مبارک مکتوب کے درود نے چونکہ شوق کو تازگی بخشی اور دل کو انگیخت ملی میں نے دل میں کہا بھلا آدمی کا انتظار کیوں کیا جائے۔ بہتر تو یہ ہے کہ خط لکھوں اور ڈاک سے بھیج دوں۔ ہر چند کہ یہ خط بھی آج ہی لکھ رہا ہوں لیکن ڈاک کا وقت نکل گیا ہے اور سارا دن گزر چکا ہے۔ (لہذا) یہ عرض داشت اب کل ہی روانہ ہوگی۔ اس سے پیشتر کے دو تحریر کردہ خطوط بھی اس ہی خط کے ساتھ بھیجے جا رہے ہیں اور گزارش یہ ہے کہ اور بھی زیادہ محبت سے ان کا مطالعہ کریں اور چونکہ (اب) حکم یہ ہے کہ خط میں سوائے اشتیاق کے کوئی دوسرا مضمون نہیں ہوگا، میں نے بھی اس آئین کو قبول کیا ہے اور یہی بہتر جانا ہے کہ (ان نجی) خطوط میں وحدت و کثرت داخل نہ ہوں اور ان کو بالمشافہ ملاقات کے وقت کے سپرد کر دیا جائے اور انشاء اللہ یہ مقصد بھی جلد ہی پورا ہوگا۔ جس طرح پہلے خط میں عرض کر ہی چکا ہوں جان صاحب قلندر کے مکان کی تاریخ جو جناب نے نکالی ہے کیا بتاؤں کتنی عمدہ ہے اور دوسری خوبی اس میں یہ کہ درویشانہ گفتگو کی نمکینی بھی موجود ہے جبکہ (عموماً) ان چیزوں کی گنجائش تاریخ میں مشکل ہی ہوا کرتی ہے۔ اگر چہ میری خواہش یہ ہے کہ ان دو خطوط میں تحریر کے آخر میں نوشتۂ سابق جو تحریر ہے اس کو تہ دل

سے مان لیا جائے۔ زیادہ ادب۔ سید صاحبان محبت آثار میر حیدر علی صاحب و میر امانت علی صاحب کو اسداللہ روسیاہ کی جانب سے یہ معروض ہو کہ ہم نے بھی آپ کی جماعت میں شامل ہو کر آپ کے ساتھ خواجہ تاشی اختیار کر لی ہے اور آپ کے آقا کو خط غلامی لکھ دیا ہے۔ امید ہے کہ آپ پر گراں نہ گزرے اور آپ کے سلسلے میں ہماری شمولیت آپ کیلئے باعثِ ننگ و عار نہ ہو۔ پیر و مرشد کی خدمت میں دوبارہ عرض ہے کہ چونکہ بوقت شب احباب کا جمع ہونا معمول ہے اور میں یہ خط اسی وقت لکھ بھی رہا ہوں اور تمام بھی کروں گا لازمی جناب عالی کا پیغام طالع یار خان کی خدمت میں رات کے وقت پہنچادوں گا (اور) عالی جناب حکیم رضی الدین حسن خان صاحب کو رباعی بھی اس ہی وقت پڑھ کر سناؤں گا۔ (ان کے) جوابات اگلے مکتوب میں لکھے جائیں گے۔ 28 ربیع الاول 1255ھ

>>☆<<

خط۔ ۲

قبلہ وکعبہ یگانہ۔ حدیث کے مطابق حقیقت واحدہ کے ماننے والے کسی چیز کو موجود نہیں مانتے۔ رخ نیاز جس طرف بھی کریں اس جماعت کی آنکھ اس ہی بنیادی حقیقت پر کھلی ہے اور لاموثر فی الوجود ولا موجود الا اللہ یعنی نہیں ہے کوئی کارفرما وجود میں سوائے اللہ کے اور نہیں ہے کوئی موجود سوائے اللہ کے بھی اس ہی سوز وگداز سے عبارت ہے۔ لامحالہ کتنی ہی عاجزی کا اظہار کروں ثنائے ایزدی ہی ہے کہ اس پردہ میں بجالا رہا ہوں۔ کافر ہوں اگر میر شکوہ کبھی غیر (اللہ) سے ہوا ہو یا خود اس شکروسپاس وشکوے اور سفید وسیاہ کا نگاہِ حق بیں میں کوئی وجود ہو۔ جس نے بھی کہا ہے خوب کہا ہے۔

دریا بوجود خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

ترجمہ: سمندر اپنے وجود (ہی) میں موج رکھتا ہے۔ تنکا سمجھتا ہے کہ یہ کشاکش اس کے ساتھ ہے۔

حق تو یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی دیکھتے ہیں، دیکھنے پر مجبور ہیں یا پھر دیکھے ہوئے ہی کی شرح کررہے ہیں۔ اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے ہر چیز کو اس کی ضد سے پہچانا ہے۔ دن کو رات سے، گرمی کو سردی سے، پست کو بلند سے اور روشن کو تاریک سے۔ ضمیر مشکیں میں یہ نہ آئے کہ یہ بات میں خصوصاً خداتعالیٰ کی کبریائی کے ضمن میں کہہ رہا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ اس بارگاہ میں تو نہ ضد کو کوئی بار ہے اور نہ مثل ہی کا کوئی مظہر ہے بلکہ اس اصول کی نمود کا مقصد یہ ہے کہ پندار ہستی کے مقام پر ہم سب اس تنگنائی کے عاجزوں میں ہیں۔ جو کچھ بھی تصور میں آئے لامحالہ اس کی ضد ہی ہو گی اور وہ (یعنی اس کی ضد یا مقابل) حق نہیں بلکہ باطل ہے۔ اور مقابل وجود نہیں بلکہ عدم ہے۔ اور یہ تقابل بھی اندازِ کلام میں تقاضائے سبقت کے مطابق ہوتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ باطل کا حق کے ساتھ اور عدم کا وجود کے ساتھ کیا مقابلہ۔ غرضیکہ مقابل حق نہیں بلکہ باطل ہے مقابل ہست نہیں بلکہ نیست ہے۔ پس ہستی کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ نیستی ہے اور جو کچھ بھی غیر موجود ہے وہ عدم ہے۔

کــل شـی " هـالـک " الا و جـهـه ۔ ہر چیز فنا پذیر ہے سوائے اس کے چہرے کے، اس لیے کہ کلام میں (بھی وہ) بغیر حروف و آواز موجود (ا) ہے۔ اس مقام کا اشارہ اور ھالک کے بھی وہ معنی نہیں کہ کوئی سمجھے کہ ان مظاہر بے بود کو بالآخر فنا ہونا ہے بلکہ اس سے مطلب یہ ہے کہ یہ سب معدوم ہیں۔ لیکن حدذات (احد) میں فنا ہو گئے ہیں اور یہ صورت ایسی نہیں کہ جس کے ثبوت ونفی کیلئے کسی دانشمند کے اقرار اور کسی ناسمجھ کے انکار کی ضرورت ہو۔ چونکہ عارف کہتا ہے۔ ''اگر جانتے ہو تب ہمہ اوست اور نہیں جانتے تب ہمہ اوست''۔

خدا جناب عالی کو سلامت رکھے۔ صوفیہ کی باتوں سے تو دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ اگر ان ساری کتابوں کو جمع کیا جائے تو کاغذ کے ڈھیر لگ جائیں لیکن ان سارے مکالمات کی اصل کو دل نہیں مانتا اور ان کا ماحصل دل نشین نہیں ہوتا اور جب تک دل ابتدا ہی سے نرم نہ ہو اور یہ رمز یہ کسی کے دل میں نہ بیٹھے تو (یہ سب اس کے لئے) بیچ صحرائے مرگ ناکامی کے مترادف ہے اور اس کا کسی صورت حصول مدعا ممکن نہیں اور اس نے اعمال تسخیرو .(1) کشف جمع نہیں کئے اور اس کی عمران مع کاری کی باتوں میں بیکار گزر گئی اور جس کسی کو اس مرحلے پر آگہی مل گئی اور اس کے ذہن میں یہ افکار بحق بایست تہ نشین ہو گئے تو پھر وہ آلودگی سے معری رہا اور رند پارسا بن گیا۔ میں نے اپنی تمام نادانی اور بے علمی کے باوجود کہ نہ ہی علم سے بہرہ ور ہوں اور نہ ہی عمل میں کامیاب، دنیا کے پیمانہ کی تلچھٹ اور خاندان بنی آدم کے لیے عار ہوں اس مرحلے پر بھی ٹھوکر کھائی ہے اور اس منزل پر پہنچتے پہنچتے (2)۔ اس کے علاوہ میں نہیں جانتا کہ دنیا والے کیا کہتے ہیں اور معرفت پر بحث کرنے سے ان کا مطلب کیا ہے۔

وہ جو جناب نے دیوان کے دیباچہ کی نثر کا حکم فرمایا ہے تو مجھ جیسے کی یہ استعداد کہاں کہ ایسے نکات کی تشریح پر توجہ دے سکوں۔ البتہ اتنا ہے کہ جو کچھ کہوں گا میری فکر (اپنے) دائرے سے باہر

1۔ متن میں کچھ الفاظ لکھے جانے سے رہ گئے ہیں۔ خالی جگہ پر نقطے ڈال دیے گئے ہیں اور خوانا الفاظ کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔
2۔ متن ناخوانا ہے اس لیے پورا جملہ چھوڑ دیا گیا ہے۔

نہیں جائے گی اور میرا قلب کہ وسوسوں کا شکار ہے بجز حقیقی عدمیت پر راجع ہونے کے (کسی دوسری صورت سے) تسکین نہیں پائے گا۔ جو کچھ کہ میرا مطمحِ نظر ہے وہ مدارجِ کمال میں سے نہیں۔ لیکن کس طرح کہوں کہ جب سے لواحقات دنیا نے دل میں گھر کر لیا ہے مجھے کیسا لطف آ رہا ہے اور شہد کے کیسے کیسے چشمے میرے روئیں روئیں سے پھوٹ رہے ہیں۔ میں خود ہی اپنی طوبیٰ و سلسبیل ہوں اور ہر سانس میں ایک قدح (مے) کے ساتھ سو تو ٹرپی جاتا ہوں۔ ان باتوں کی چونکہ انتہا نہیں اس لیے مجبوراً حقیقت پسندی کی طرف آتا ہوں اور کھلے بندوں مستانہ وار حکایت ختم کرتا ہوں۔

بندہ نواز۔ ان دنوں جناب کے دو مکتوب پہنچے اور انہوں نے مجھے میری اپنی نظر میں آبرو بخشی افسردگی و کسلمندی نے مہلت نہ دی کہ جواب دیا اور خط تحریر کیا جائے (لیکن) اب کہ مضراب پرسش کی زخمہ زنی کی آواز تیز تر ہوگئی ہے تو نغمہ ہائے پوشیدۂ زیرِ لب بھی سر نکالتے ہیں۔ سب سے پہلے تو نوازش و کرم کا سپاس جناب کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور پھر یہ عرض ہے کی مخدوم مکرم و مطاع معظم سید بدرالدین علی خان صاحب المعروف بہ فقیر صاحب کہ اسداللہ کا دل ان کی قید مہر و وفا میں ہے اکثر اوقات ازراہ لطف و نوازش میرے غمکدہ پر تشریف لاتے ہیں۔ جناب کے ارشاد گرامی کے مطابق چونکہ میں نے ان کی دلداری کی اور ان سے ہمدردی کا اظہار کیا تو مجھے تو وہ بہت درد آشنا، شکستہ دل، نا امید، خونیں جگر، بھائی کی موت سے بھی دل پر سینکڑوں زخم کھائے اور اپنی بے بسی سے اپنا ہاتھ اپنے گریبان (1) کی طرف بڑھائے ہوئے (انسان نظر آئے)۔ کبھی وطن چھوڑنے کا ولولہ کبھی غربتِ ہمیشگی کا التزام ان کی زبان پر ہوتا اور کبھی ترکِ لباس کے ذوق کے گداز سے مغزِ سخن سے دھوئیں اٹھا دیتے۔ سچ تو یہ ہے کہ زندان غم کا عاجز کیا کرے اور دردِ تنہائی کا گرفتار کس طرح افسردہ نہ ہو چونکہ میں بھی ان کی خاطر خواہ مدد نہیں کر سکتا ہر گھڑی ان کے دکھ پر افسوس کرتا ہوں اور ان کی ذات کی سلامتی و حالات کی درستی کی خدا سے دعا کرتا ہوں۔ غرضیکہ ہزار گونہ یقین دہانیوں کے بعد میں نے فقیر صاحب کے جناب کے مہر زدہ مختار نامہ کی طلب پر راضی کر لیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ

---

1. متن میں گریبان کی جگہ دامن ہے۔ تنگی دل میں ہاتھ دامن کی طرف نہیں گریبان کی طرف بڑھتا ہے۔

اسٹامپ معہ مسودہ ھبہ نامہ ومختار نامہ جناب کی خدمت میں ارسال کر دیں۔ ان کاغذات کے پہنچنے پر اپنی مہر لگا کر عنایت کی جاسکتی ہے اور یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ ...... آں جناب کیلئے اپنے فرزندوں میں سے فقیر صاحب بھی کسی طرح کم نہیں۔ بے شک اس بے چارے کو شفقت پدری سے محروم نہیں کرنا چاہیے اور خاص طور پر تو اس قسم کی مخلوق کے حق میں تو یہ آثار ربوبیت کے مظاہر میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ اس سے زیادہ سوائے اس کے کہ ہیچ ہوں بلکہ نہیں ہوں اور کیا لکھوں۔ محررہ غرہ ربیع الثانی بروز پیر 1200ھ

>>☆<<

خط۔ ۷

قبلۂ دیدہ و دل خدا آپ کو سلامت رکھے۔ میں جانتا ہوں اور میرا دل کہ گرامی نامہ کے ورود کے فیض نے میرا کیا حال کیا۔ (بھڑکتی) آگ پر (گویا) پانی ڈال دیا اور چراغ آگہی روشن کر دیا۔ بے شک اس صحیفہ پاک نے ایک (ایسی) شمع دکھادی جس پر روح کی پروانگی کی آرزو کروں۔ کیا کروں وقت کم ہے اور باتیں بہت۔ جمعہ کا دن ہے۔ ستائیسویں شعبان اور صبح کا وقت ہے اور میں تا حال جن (جھگڑوں) میں مبتلا ہوں ان سے فراغ نہ پا سکا ہوں اور آدمی روزنگی سفر پر کمر کسے میرے سامنے بیٹھا ہے۔ (جناب کے) دیوانِ فیض آثار میں جو کچھ میں نے دیکھا کافر ہوں جو مجھے مثنوی مولوی روم میں یا دوسری تصوف کی کتابوں میں نظر آیا ہو۔ خصوصاً رباعیات میں کہ میں کہ ہر کوزہ میں ایک دریا اور ہر ذرے میں ایک آفتاب (سمایا) ہوا ہے اور اگر زندگی باقی ہے تو رباعیات کا حال اس کے بعد تحریر کیا جائے گا۔ اتنا ضرور خاطر نشین ہو جائے کہ ہم نے بھی اس ہی مسلک سے اور اس ہی عقیدے کے ساتھ دل لگایا ہے۔ اب یہ تو اختتام پر یہی معلوم ہوگا کہ کس پردے سے باہر سر نکالتے ہیں اور کس قبیل میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔ دیوان تازہ مخدومی مکرمی سید بدرالدین علی خان معروف بہ فقیر صاحب کے حوالے کیا گیا اور اس سے سابقہ دیوان لے کر جناب کے ملازم کو واپس دے دیا گیا ہے۔ یہ خط اتنی جلدی میں کہ نا قابل تصور ہے، لکھا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (جناب کے) نوازش نامہ کا جواب میں نے تا حال نہیں لکھا۔ زیادہ حد ادب، مشفقی میر حیدر علی صاحب کو سلام کے بعد معلوم ہو کہ پیر علی صاحب ان دنوں دہلی آئے تھے۔ ان کو ایک مدت کے بعد میں نے دیکھا وہ آج ہی آگرے روانہ ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تقریباً ایک ماہ آگرے میں گزار کر گوالیار جائیں گے۔ (یہ بات) اطلاعاً لکھی گئی۔ عرضداشت۔ اسد اللہ روسیاہ۔ فقط

>>☆<<

خط ۔ ۸

خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اپنے شوق کا ممنون ہوں کہ اس نے مجھے ایسے دل میں جگہ دی ہے کہ جب تک ستر پانیوں سے اپنا منہ اور زبان نہ دھولوں اس کا نام لینے کے لائق نہیں۔ نیک بختی کے ستارہ کی روشنی، چمن افادت کی بہار، بے کراں نوازشات کا منبع، خدا کی رحمت کے حصول کا ذریعہ، نورالانوار کا فروغ یافتہ، ہدایت ابدی ورراہ یابی ازلی کے ذریعہ مقام تمع اتمّ کے راہ یافتہ، مرشدی ومولائی ومخدومی حضرت میر سید علی نے چونکہ مجھ جیسے (حقیر) پر نوازش کی اور قیمتی (الفاظ) خطاب سے یاد کیا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سورج کوڑے کرکٹ پر بھی چمکتا ہے اور بادل خس وخار کو بھی محروم نہیں کرتا۔ صحیفۂ قدسی کے ورود کے فیض نے آگہی کے جسم میں زندگیاں پھونک دیں اور دیوان معجز بیان میرے لیے بلندی منزلت کی سند بن گیا۔ واہ رے میری قسمت کہ میرا نام ان کے قلم سے تحریر ہوا اور کیا کہنے میرے نصیب کے کہ کلام قدسی مجھے پہنچے۔ غزلیں ایک معیار کی، نکات ہموار، مضامین عارفانہ اپنی جان وایمان کی قسم کہ یہ زبان [1] میں (ایسا) کونسا صاحب نظر ہوں اور معنی کے ایسے طلسمات تو میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھے۔ ان اوراق کی سیاہی نے (ایسا) سرمہ سلیمانی میری آنکھوں میں لگا دیا کہ میری نظر جلوہ ہائے بے رنگ سے آشنا ہو گئی۔ خستگان صورت کو کیا معلوم کہ گفتار کے یہ موتی کس عالم (بالا) کے ہیں اور یہ گرد کس قافلہ (آسمانی) سے اٹھ رہی ہے۔ قبلہ وکعبہ خدا کرے اس قدر محفوظ خاطر رہے کہ ہر چند کہ ایک رات اس ہی شہر میں کہ جس کا نام دہلی ہے ایک رات آپ کی قدم بوسی سے شرف یاب ہو چکا ہوں اور اس کو اپنی نجات کا ذریعہ (بھی) تصور کرتا ہوں لیکن اس بات پر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میرے کانوں کو سماعت اور چشم ادراک کی بینائی نصیب نہیں تھی کہ اس بات کے بارے میں جواب دل میں

---

[1] متن میں بے ربط وبے معنی الفاظ ہیں چنانچہ ان کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

کھٹک رہی ہے اور جس سے (اب) میرا ذہن دست و گریبان ہے، چند باتیں پوچھ لیتا اور مقصد آگاہی کو ترقی دیتا۔ آتشِ شوق بھی بھڑک اٹھتی اور چراغِ شناخت بھی نورفشاں ہو جاتا۔ ہر چند عقل یہ سوچتی ہے اور اس ہی پر میرا یقین ہے کہ ہستی صرف واحد ہے لیکن اکثر وہ مظاہر بے بود جو خودی کے ابھارے ہوئے نقوش ہیں دل میں گھر کر لیتے ہیں اور دل خوش اور ناخوش ہی سے ٹکراتا ہے۔

خدارا اس نیم سوختہ پر ایک ایسی نظر ڈالیں کہ مکمل جل جائے اور دھواں، چنگاری اور خاک سب نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ مجھے علم ہے کہ میری آرزوؤں کی میرے حوصلہ ارزش کے مطابق سائی ممکن نہیں لیکن میں نے سن رکھا ہے کہ کیمیا سے تانبا بھی سونا ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا عرض کروں چونکہ نامہ بر پابہ رکاب ہے اور مکرمی سید بدرالدین علی خان بے چین۔ انشاء اللہ العظیم اس کے بعد نیاز نامے خدمت عالی میں پہنچ گئے۔ مشفقی سید حیدر علی سلام کہتے ہیں اور (آپ کو بھی) مشتاق تصور کرتے ہیں۔ نوشتہ اسد اللہ۔ پچیسویں ذی الحجہ رات کے وقت چراغ کی روشنی میں لکھا گیا۔ (۱۲۵۵ھ۔ ۱۸۴۱ء)

>>☆<<

خط ۔ ۹

حضرت پیرو مرشد برحق خداتعالی آپ کے سایہ کو دوام بخشے۔

بہت سے دن راتوں میں اور راتیں دنوں یں تبدیل ہو گئیں تب کہیں میری نیک بختی کی صبح افق اقبال سے طلوع ہوئی اور فرمانِ نور افشاں جان کے بازو کا تعویذ بنا۔ طالع یار خان کا خط اور حکیم قطب الدین خان کا خط دونوں طالع یار خان کے سپرد کر دیے گئے اور جناب کا حکم بھی پہنچا دیا گیا۔ وہ خط کہ جو بنام گرامی فقیر صاحب تھا وہ ان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ غالبًا آج یا کل میرے پاس آئیں گے تو جناب کا پیغام زبانی بھی دے دوں گا۔ میں رشک سے مرا جا رہا ہوں کہ دوسرے لوگ گوالیار کے سفر کے ارادے کر رہے ہیں لیکن میرے لیے تا حال اس فیصلہ کی گھڑی نہیں آئی کہ جال سے باہر نکل سکوں۔ خدا کرے کہ جلد ہی میری مراد پوری ہو اور حکم ولایت کے انتظار کی گھڑیاں اور وقت فراق تمام ہو۔ ان ہی دنوں میں احباب میں غزل کیلئے ایک طرح طے ہوئی تھی اس زمین میں دس اشعار ہوئے تھے۔ بامید اصلاح اس خط میں تحریر کی جاتی ہے۔

؎ در وصل دل آزاریٔ اغیار ندانم
دانند کہ من دیدہ ز دیدار ندانم

ترجمہ: میں وصل میں اغیار کی دلآزاری کا متحمل نہیں۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ میں دیدار کو آنکھ سے علیحدہ نہیں سمجھتا۔

زیادہ حدِ ادب منجانب اسد اللہ۔ محررہ اٹھارہ جب ۱۲۵۵ھ ۱۸۴۱ء۔

اسی دن سید حیدر علی صاحب کا خط (پہنچا) اور سید امانت علی صاحب سلامِ نیاز کہتے اور مشتاق تصور کرتے ہیں۔

ع بندۂ شاہِ شما ایم و ثنا خوان شما

ترجمہ: ہم آپ کے بادشاہ کے غلام اور ثنا گر ہیں۔

مکرمی جناب حکیم رضی الدین حسن خان حضرت صاحب کی جناب عالی میں مراسم تسلیم

وآداب پہنچاتے ہیں۔ فقط

>>☆<<

خط۔ ۱۰

رباعیات کے ضمن میں بات کی جاتی ہے۔ خدایا کہیں میرا بیان پیرومرشد کے مزاج کے خلاف نہ ہو۔ تین رباعیات کا کہ جو شروع میں لکھی گئی تھیں، یہ مضمون تھا کہ حضرت علیؑ خلیفہ تھے لیکن میرا یہ عقیدہ نہیں ہے میں علیؑ کو امام مانتا ہوں اور دوسروں کو خلیفہ۔ خلافت سلطنت اور ریاست کے مترادف ہے۔ عربی میں سردار یا حاکم کو خلیفہ کہتے ہیں اگرچہ اس کے لغوی معنی نیابت کے ہیں۔ غرضیکہ علی نبی کے بعد بلا فصل امام ہیں اور امامت ایک امر منجانب اللہ ہے اور علیؑ ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں بھی اور عثمانؓ کے عہد خلافت میں بھی امام ہیں اور یہ جو مشہور ہے کہ حضرت علیؑ، عثمانؓ کے بعد خلیفہ ہوئے غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام برحق (علیؑ) مرتضیٰ جب رسول کے بعد امام ہوئے تو (انہوں نے) ابوبکرؓ صدیق کو خلیفہ بنا دیا اور امور قضا ان کے سپرد کئے تاکہ مسلمانوں کے درمیان دشمنی کا ازالہ کیا جا سکے اور وہ مسلمانوں پر فرمانروا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے عمرؓ کو منتخب کیا اور ان کے بعد عثمانؓ کو خلافت دی۔ ان تینوں اشخاص نے تن برضائے منصف سپرد کیا اور نبی و امام کی اطاعت قبول کر لی لیکن عثمان کے بعد مسلمانوں میں عہدۂ قضا کے لائق کوئی شخص نہ پایا گیا اور جو اس کی آرزو کرتا تھا وہ بھی اس لائق نہ تھا۔ مجبوراً امام وقت نے قضا کا عہدہ اپنے ہاتھ میں لے لیا (اور) اپنی توجہ مسلمانوں کی دشمنیوں کے ازالے پر مبذول کر دی۔ بادشاہ اگر قاضی کے فرائض انجام دے تو اس کو قاضی نہیں کہتے۔ غرض یہ کہ علیؑ امام ہیں عہد ثلاثہ میں (بھی) عثمانؓ کے بعد خلافت بنی امیہ میں منتقل ہوئی اور اس جماعت سے آل عباس کو پہنچی اور ان دونوں جماعتوں نے (سابقہ) تینوں خلفا کے برخلاف مظالم کئے خون ریزیاں کیں اور علیؑ اور ان کی اولاد کی امامت کو مٹا دیا اور اماموں کو قتل کر ڈالا۔ اسد اللہ۔

>>☆<<

غمگینؒ کے فارسی خطوط

کا اردو ترجمہ

خط ۔۱

اے میرے مشفق ! اس اعتراض پر جو آپ نے لفظ ''غیر'' پر کہ (فی نفسہ) باطل ہے کیا ہے، مجھے بڑی خوشی ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ندرت خیال اور اندازِ بیان کے باوصف ہماری ملاقات بھی کرائے ۔سو اب اس کا جواب بھی سن لیجئے۔ ''غیر'' ایک بے معنی لفظ ہے۔ چونکہ وہ دراصل ''عین'' ہے غیر نہیں، لہذا غیر کے کوئی معنی نہیں ہوئے۔ اگر عین کہو تب اور غیر کہو تب نشان وہی حق ہی کی ہوتی ہے اور (اس طرح) یہ دونوں الفاظ ایک ذات ہی کی صفت ہیں۔ اسی طرح لفظ 'غیر' کو 'تقید' کے اور 'عین' کو ''اطلاق'' کے مرتبے پر رکھ کر غور کریں اور اگر میں، تُو اور وہ کو جو دوئی سے وجود پاتے ہیں، عبارت سے خارج کر دیں تو (اصل) معنی حاصل ہو جاتے ہیں، ورنہ تنقید کے طور پر تو آپ جو کچھ بھی کہیں جائز ہے۔ (صرف) کہنے سے غیر غیر نہیں ہو جاتا اور عین عین نہیں ہو جاتا۔ وہ جو (موجود) ہے وہ بے نام ونشاں (موجود) ہے۔ ہر جگہ اک نیا نام ونشاں رکھتا ہے۔ اسی لیے ابن عربی قدس سرہٗ جب اپنے الفاظ میں ('عین کی) تعریف کرتے ہیں تو فرماتے ہیں۔ (ترجمہ عربی) ''پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے آپ کو لطیف بنایا اور اپنا نام رب رکھا اور پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے آپ کو مکشوف (ظاہر) کیا اور اس کا نام 'عبد' رکھا'' ۔لیکن تعجب کی بات ہے کہ اسی اعتراض پر میں نے سہیل بن تستری اور حضرت خواجہ جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کو نقل کرتے ہوئے آپ کے خط میں لکھا تھا کہ بزرگوں نے یہی کہا ہے۔اب چونکہ آپ کو بزرگوں کے قول پر یقین نہیں تو میں ایک حدیث بھی تحریر کرتا ہوں۔ حدیث ہے کہ اسی طرح ایک بار رسول مقبولؐ اصحاب صفہ سے محو گفتگو تھے کہ حضرت عمرؓ تشریف لے آئے۔ رسولؐ مقبول خاموش ہو گئے۔ جب حضرت عمرؓ کسی دوسرے کام میں مصروف ہو گئے تو رسولؐ اللہ نے دوستوں (اصحاب) سے فرمایا کہ کہیں آپ لوگوں کے دل میں یہ شک نہ آئے کہ میں حضرت عمرؓ سے کوئی بات چھپا رہا تھا۔ (دراصل) اس وقت وہ بات ان سے کرنا مناسب نہیں تھی۔ اس لیے خاموش ہو گیا۔ اور حضرت شبلی قدس سرہٗ پر جب کیفیات واحوال کا غلبہ ہوا تو انہوں نے برسرِ منبران باتوں (عرفانیات) کا آغاز کر دیا۔ (چنانچہ) حضرت جنید قدس سرہٗ نے ان سے کہا کہ میں نے جو باتیں

تجھ سے تہہ خانوں میں کی ہیں تو اعلانیہ لوگوں سے کرتا پھر رہا ہے۔ شبلیؒ نے جواب دیا میں جو کچھ سن رہا ہوں وہی (کہہ) بتا رہا ہوں (سواب) آپ کو اختیار ہے الا فلا (اگر نہیں تو پھر نہیں)

ہر بات کا ایک وقت اور ہر نکتے کی ایک جگہ ہوتی ہے۔''

اے میرے مشفق یہ قوم (مسلمانان عالم) ہمیشہ سے خدا کے واسطے ہی خدا سے برسر پیکار ہے۔ ہر لمحے ایک زنار باندھتے اور توڑتے ہیں تا کہ کفر و اسلام کے مراتب اعلیٰ حاصل کر سکیں۔ توجہ فرمایئے کہ (بزرگانِ دین) نے اکثر اسرار (معرفت) پوشیدہ رکھے ہیں۔ تو اگر میری رباعیات (کے عنوانات) پر کسی کی نظر پڑ گئی تو وہ ایک دکان سجالے گا اور اپنے آپ کو ان کا (قیاسی۔ خالق) ظاہر کرے گا، خلق خدا کو گمراہ کرے گا اور نقالوں کی بعض باتوں کی فہم بھی (خلق خدا کے ساتھ) یہی عمل کرے گی۔ (چنانچہ) ایک وہ وقت آجائے گا کہ ان رباعیات کا راز (بھی سارا) افشا ہو جائے گا۔ (اس لیے فی الحال) اس کو اسی طرح (پردے ہی میں) رکھیے۔

میں (اس ضمن میں) مجبور ہوں چونکہ بزرگان دین اسی طرح کرتے رہے ہیں۔ اور ہم (سالکانِ طریقت کو) جو حضرات قادریہ ونقش بندیہ (کے زمرے میں آتے ہیں) ابتدائے سلوک سے لے کر انتہائے جذب تک اسرار لکھنے کی ممانعت تھی اور وہ اس وجہ سے کہ یہ اسرار شاذ ہی کسی نے لکھے ہیں۔ اور تعمیل حکم کے طور پر اگر لکھے بھی گئے ہیں تو عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ ہر دیکھنے والا بذریعہ نظر حقیقتِ معنی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور ہر وہ شخص جو (حقیقت) معنی تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے لازماً غیر نہیں۔ ''سیر لاقطاب'' میں اسی طرح یہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت معین الدین چشتی قدس سرہٗ نے حضرت محبوب سبحانی سے ملاقات پر عرض کیا کہ خدا تعالیٰ کی کوئی بات کیجیے تو اس پر حضرت محبوب سبحانی نے فرمایا کہ ایسی بات کے لیے کوئی گوشہ چاہیے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ گوشے کی حاجت اس لیے نہیں کہ اگر وہ خدا تعالیٰ ہی کی بات ہے تو پھر اس سے دریغ کیسا اور اگر وہ بات (فی نفسہٖ) خدا کی بات نہیں تو وہ (اپنی نارسی کے سبب) خود بخود (سامع) تک نہیں پہنچ پائیگی۔ لیکن یہ حکایت سوائے سیرُ الاقطاب کے کسی دوسری مستند کتاب میں نہیں پائی گئی اور مورخوں میں سیر الاقطاب کا کچھ زیادہ اعتبار بھی نہیں۔ اور ہر وہ شخص جس نے اس راہ (طریقت) میں قدم رکھا ہے اس پر اس حکایت

کی ضعیفی ہویدا ہے اور (عیاں ہے) کہ اس کی کوئی سند نہیں، بطور منقول کتاب میں در آئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ (بھلا) غیر کون ہے؟ تو غور فرمائیں کہ اِس عالم میں تم (بذاتِ) خود اپنے (لیے) غیر ہو تو غیر کا کیا کہنا، (البتہ) یہ بات ذرا باریک ہے۔ کوئی شخص جو اس مرتبے پر نہیں پہنچا (اس کو) سمجھ نہیں سکتا۔ رسول اللہ صلعم سے لے کر اِس زمانے تک تمام صوفیا نے ان امور کو عوام الناس سے پوشیدہ رکھا ہے۔ (سو) لازم ہے کہ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ اور فی الوقت اس حقیقتِ عینِ تامہ کو بھی "غیر" ہی تصور فرمائیں۔ میرے بھائی آپ یہ خیال فرمائیے کہ ایک لامتناہی وجود ہے اور اس وجودِ بے حد و بے کنار میں صفات سمائی ہوئی ہیں اور ایک سالک کو دوسرے کی خبر نہیں ہے۔ (لہٰذا) مناسب یہی ہے کہ آپ بھی اس فقیر کے کہے پر عمل فرمائیں۔ (بظاہر) جب تک (بالمشافہ) ملاقات نہیں ہوتی آپ کی اپنے تصور "عین و غیر" سے نجات مشکل ہے۔ عاقل کو اشارہ کافی ہے۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ (مجموعہ) رباعیات کے دیباچے میں میری تعریف نہ فرمائیں اور اس نیاز مند کو میری حیثیت پر ہی رہنے دیں کہ اس میں کوئی نقصان نہیں۔ تو عرض یہ ہے کہ دوست یہ چاہتا ہے کہ کوئی شخص اس کے دوست کی تنقیص نہ کرے اس لیے ہزار طریقوں سے اس کی تعریف کرتا ہے سو میں آپ کی تعریف کیوں نہ کروں لیکن اس قدر ضرور باور کیجئے کہ میں جھوٹ نہیں بولونگا اور میری تقصیر معاف، خدا تعالیٰ سے قوی امید رکھتا ہوں کہ بعد ملاقات آپ کا اعتراض بھی رفع ہو جائے گا آمین یا رب العالمین۔

عارف جانتا ہے اور دیکھتا ہے کہ روئی (لباس کی شکل میں) آپ کو پورے طور پر ڈھانپ لیتی ہے لیکن چادر کو یا دستار کو روئی نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح 'عین' اور 'غیر' کو بھی قیاس فرمائیے۔

رباعی

اس ایک وجود میں کیا ہے کیا سیر
زاہد ہے حرم ہے اور غمگیں ہے دیر
اسما و صفات ہیں یہ فہمائش کے
کہنے سے عین ہو نہ کہنے سے غیر

رباعی

گو چرخِ چہار کی تجھ کو ہو سیر
اس کا تو غیر اور ترا ہے وہ غیر
یہ شرِ خودی نہ جائے جب تک تجھ سے
حاصلِ عینیت، غمگیں ہے خیر

ایک شخص حضرت شبلیؒ کے پاس آیا اور اس نے کہا عارف کس کو کہتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا (عارف وہ ہوتا ہے) کہ جسے سات آسمانوں میں ایک بال تک نظر آتا ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور شخص آیا اور اس نے (بھی) یہی پوچھا عارف کسے کہتے ہیں۔ شبلی قدس سرّہ نے جواب دیا (عارف) ایک مچھر کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک اور شخص جو وہیں بیٹھا ہوا تھا یہ سب سن کر حیران ہو گیا اور اس نے کہا اے شیخ پہلے آپ نے کیا کہا تھا اور اب آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا پہلے میں نہیں وہ (خدا) بول رہا تھا۔ اس وقت میں (بول رہا) ہوں۔ عالِم اور عارف میں یہی فرق ہوتا ہے۔

رباعی

عارف کو یہی دوام رہتی ہے سیر   اک دم میں تو شر ہے اور اک دم میں خیر
ہیں مختلف آن آن غمگیں حالات   گا ہے، ہے عین اور گا ہے ہے غیر

اور 'غیر' کی تفہیم اس سے بھی ہو سکتی ہے کہ اغیار سے ہماری مراد مقلّدین سے ہے۔ اور تقلیدی شخص ہی وہ شخص ہوتا ہے کہ (دنیاوی) عزت و نام و نمود کے لیے اس علم کو حاصل کرتا ہے لیکن اس پر (خود) عمل نہیں کرتا۔ یعنی وہ عالِم بے عمل و بے حال ہوتا ہے اور آپ اگر اس امر کی حقیقت پوچھیں اور اس کو (میرا) تکبّر نہ تصور کریں اور اپنے بھلے کا خیال رکھیں تو ہمارا 'غیر' آپ کے 'عین' سے بہتر ہے۔

رباعی

وہ شخص لطیف اور وہ فہم ہے پاک   شائستہ ہو اسپ عقل جس کا چالاک
غمگیں جو رخش بے محابا ہو تیز   انسان کو شرط اس سے ہے خوف و باک

زیادہ۔ والسلام

....☆☆☆...... ....

خط۔۲

اے میرے مشفق۔ (جناب کا) مکتوبِ گرامی ملا، میں نے پڑھا اور خوش ہو گیا، پریشانیِ خاطر طمانیت قلب میں تبدیل ہوگئی۔ (اصل میں) یہ مذہب خواص کے لیے (عقائد کی) ابتدا ہے (چنانچہ) عوام کے لیے نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے عموماً لوگ شک و وہم کا شکار ہوتے ہیں اور یقین (ان کو) حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان کو یقینِ کامل کی آگاہی بھی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اپنی ذات کی آگاہی تک اسی عقیدے پر (قائم) رکھے۔ اور آپ کے اس عقیدے کی دریافت پر میں اس قدر خوش ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ سبحان اللہ یہ مذہب پاکوں کا اور خواص کا (ہے)۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس مذہب کی (پیروی کی) ہدایت کرے۔ اور وہ جو کچھ بھی آپ نے عقیدے، اپنی معلومات اور بزرگوں کے احوال کے بارے میں لکھا ہے وہ سب درست اور ٹھیک ہے۔ اور (مجھ) فقیر کو تو آپ سے ایسی محبت اور نسبت ہوگئی ہے کہ میرا دل خود بخود آپ کی جانب کھینچا جاتا ہے۔ سو بھلا ناراضی کا کیا محل، نہ آپ کو مجھ سے کوئی دینی یا دنیاوی غرض۔ (آپ تو) عنایتاً خدا واسطے پر (مجھ سے) محبت کرتے ہیں۔ تو ایسے شخص سے کہ خدا واسطے پر محبت کرے کوئی ناراض کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ تو اپنے غلبۂ محبت سے بے قرار ہو کر میں نے جناب کو تحریر کر دیا کہ مجھے اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔ میں نے عشق و محبت کے زیر اثر آپ کو جو کچھ لکھا آپ نے اس کو خفگی پر محمول کیا۔ بھلا میں کیا اور میری حیثیت کیا اور کس وجہ سے آپ پر خفگی کا اظہار کروں بلکہ یہ جو کچھ بھی میں نے آپ کو لکھا تھا اپنی طمانیت کی خاطر لکھا تھا۔ معاف فرمائیے۔ (مزید یہ کہ) آپ کے خط کے آنے سے پہلے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی بزرگ کے ذریعے ''بے رنگی'' تک پہنچ چکے ہیں اور آپ نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے میں اس سے کہیں زیادہ سمجھ چکا ہوں، (مزید) لکھنے کی ضرورت نہیں۔ (دراصل) کسی شخص نے مجھے آپ کے عقیدے کے بارے میں بتایا تھا اس وجہ سے پریشان ہو کر میں نے آپ کو خط لکھ دیا۔ فی الوقت کوئی (پریشانی) نہیں۔ خاطر عالی جمع رکھیے۔ آپ نے سید امانت علی سے اپنے سوال و

جواب (کی تفصیل) لکھی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ نیم حکیم خطرۂ جان و نیم ملاّ خطرۂ ایمان۔ لیکن آپ کی بات البتہ سیّد (امانت علی) کی بات پر فوقیت رکھتی ہے۔ اور یہ اس لیے کہ ''حصول'' کے بعد یہ کیفیت خود بخود (طاری) ہو جاتی ہے ورنہ عام و خاص میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ آپ نے درست لکھا ہے کہ اس جماعت میں جو منزل ''بے رنگی'' پر پہنچ جاتا ہے اُس کو علم والیقین حاصل ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کی طبیعت دوسری جانب مائل نہ ہو جائے۔ چونکہ بے رنگی میں (بھی فی نفسہٖ) جس قدر ہدایت ہے اسی قدر گمراہی بھی ہوتی ہے۔ اس بات کی شرح (البتہ) طویل ہے اور آپ پر تو یہ واضح ہے کہ اسی وجہ سے بعض صوفیائے کرام نے معرفت الٰہی کو ''معقول محض'' قرار دیا ہے۔ اگر کسی کی (ذہنی) تربیت اس نہج پر ہو تو اسی وقت علم الیقین حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس طریقے میں کشود کار نہیں آتا۔ ایک مدت اور طویل عرصے کے بعد ممکن ہے کہ ''حیرت مذموم'' حاصل ہو جائے۔ ابتدائے سلوک میں بے رنگی کا مشاہدہ اور مراقبہ میں نے بھی بہت کیا ہے۔ اِس طریقہ کار میں سالک تحصیل سے معرّا ہو جاتا ہے (لیکن) ایک جذبی نسبت کے حصول کے سبب اس قدر فائدہ ہوتا ہے کہ ضبط تحریر میں نہیں آسکتا۔ اور اگر یہ طریقہ جذب سے پیشتر ہی حاصل ہو جائے تو یہ (مرتبہ) ابتدائے خواص کا ہے اور اگر نسبت جذبی کے حصول کے بعد ہو تو انتہائے خواص کا۔ اور چونکہ یہ (معاملہ) عقلی ہے بغیر کسی صاحبِ جذب کی صحبت کے حاصل نہیں ہوتا۔ اے میرے مشفق قصور معاف اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو آپ کی ہمت بلند کو زیب نہیں دیتا کہ آپ اس ہی (منزل) پر اکتفا کر بیٹھیں۔ اور یہ اس لیے کہ اگر کسی دس سال کے بچے کو اس طرح بے رنگی کی تعلیم سے متصف کر دیا جائے تو میں اور آپ اور وہ بچہ علم الیقین کے علم کے لحاظ سے برابر ہیں۔ لیکن آپ اگر اس مقام پر خوش ہیں تو یہ بھی کافی ہے۔ (لیکن) اس مقام پر ہونے والے کے لیے حال کی ایسی آگاہی نہیں ہوتی کہ دوسرے کو اس حال سے آگاہ کر دے۔ اور آپ نے جو کچھ قولاً و تحریراً معرفت حال کے بارے میں اظہار کیا ہے تو اس معرفت کو معرفت علمی و معقول محض و کلمتہ الحق کہتے ہیں۔

بے زارم ازآں گونہ خدائے کہ توداری

ہر لحظہ مرا تازہ خدائے دگر ست

ترجمہ: میں تیرے والے خدا سے بیزار ہوں

ہر لمحے میرا تو ایک نیا اور تازہ خدا ہوتا ہے۔

اور وہ کیفیات واحوال کہ جن سے خدا آپ کو عین الیقین اور حق الیقین تک پہنچنا نصیب کرے اس مشاہدۂ بے رنگی کو ہندی زبان میں بعض صوفیوں نے گیان کہا ہے چونکہ اس مشاہدے سے انسان ترقی نہیں کرتا اور کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا۔ آپ سے ملاقات کی آرزو رکھتا ہوں لیکن اس بے رنگی اور بے رنگی کے مشاہدے کے لئے نہیں کہ نظر ہوا پر جمائے کسی خیال کو ذہن میں بیے ہوں۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں

کانجا ہمیشہ باد بدست است دام را

ترجمہ: عنقا کا کوئی شکار نہیں کر سکتا۔ (اے مخاطب) اپنا جال لپیٹ لے

اس جگہ نہ جا جہاں سوائے ہوا کے ہاتھ کچھ نہ آئے

حدیت ہے کہ تفکروافی صفات اللّٰہ و لا تفکروافی ذات اللّٰہ۔

ترجمہ: اللہ کی صفات پر غور کرو لیکن اس کی ذات پر غور نہ کرو۔ اور یہ اسی لیے کہ اس میں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور کوئی شخص آج تک اس کی ذات کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکا۔ اور اگر لوگ اس بات پر اکتفا کر کے اندرونی گوناگوں کیفیات سے دور رہے ہیں تو یہ ایک دوسرا حال ہے اور وہ طریق عقل سے ماورا ہے اور وہ حال ذوقی اور جذبی ہے اور وہ حال ایسا ہے کہ عقل کی آنکھ اس کے نظارے کی تاب نہیں رکھتی۔

رباعی: غمگین ہوتا اگر تجھے علم یقیں
بے عین یقیں نہ ہوتی دل کو تسکیں
بہر حق یقیں کے ذوق اور شوق میں یار
ہوتا بس حق حق ترا ملت و دیں

اور ہر وہ شخص کہ وجدانی کیفیت سے آشنا نہیں ہوتا مجھ خاکسار کی بات کو خلاف عقل تصور کرے گا۔ مثلاً اگر کسی نے (کبھی) نمک نہ چکھا ہو آپ ہزار اس کے ذائقے کو اس کے سامنے بیان کریں، اس کی لذت سے بے بہرہ ہی رہے گا تاوقتیکہ وہ خود نہ چکھ لے۔ میں تیس سال سے جذب کی آفت میں گرفتار ہوں۔ چنانچہ کبھی کبھی مجذوبوں کی طرح باتیں کرتا ہوں۔ (سو) اگر میں نے (آپ کو بھی) کوئی ایسی چیز لکھ دی ہو یا (آئندہ) لکھ بھیجوں تو دوستوں کی عنایت کے طور پر معاف فرمائیں اور (مجھے) معذور گردانیں کہ ایک دیوانے پر شرع کے آداب نافذ نہیں ہوتے۔

رباعی: اک عمر رہی میری اللہ کی جنگ
دیتا میں رہا شکست سو سو فرسنگ
غمگیں مغلوب اب ہوا ہوں ایسا
نہ فوج رہی نہ میں نہ وہ نام و ننگ

فی الحال معرفت کے بارے میں فقیر کا عقیدہ سوائے عجز اور بے معرفتی کے کچھ نہیں۔ چنانچہ

رباعی: عقل کہے جو اسے نہیں وہ عاقل
وجدانی جو سمجھے وہ نہیں ہے واصل
کہتے نہ رسول ماعرفنا غمگین
جز عجز نہ ہوتی معرفت گر حاصل

دیگر رباعی: تو قولِ علیؑ میں اور مت لا شبہات
غمگیں ہے یہی عرفت ربّی کی بات
ہے فسخ عزائم اس لیے فرمایا
آتی ہی نہیں علم میں کُنہِ ذات

اور عقلی و وجدانی کے درمیان جو فرق ہے وہ واضح ترین ہے۔ (اور وہ اس طرح) کہ عقلی صاحبِ معرفت جب تک کہ تمام تعینات کو دل سے محو کر کے اپنے آپ کو بے رنگی کے حوالے نہیں کر دیتا حیرتِ مذموم کی منزل پر بھی نہیں پہنچ پاتا اور اس پر بھی اس کو اختیار نہیں ہوتا۔ جب کہ صاحبِ (معرفت) وجدانی کسی کام میں بھی کیوں نہ مشغول ہو یہ کیفیت اس میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، (اس کو) قصد کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اس کیفیت کا اور اس کو (بھی) اختیار نہیں ہوتا چونکہ آں جناب مشفق نے دوستانہ محبت و لگانگت کے تحت مفصل آ گاہی عطا کی تو اِس نیاز مند کو بھی ضرورت ہوئی کہ مختصراً اپنے تجربات تحریر کر دے اور چونکہ جب میرے شیخ علیہ رحمتہ کی موت کا وقت نزدیک آ گیا تو ایک روز مجھ سے تنہائی میں فرمایا کہ تیرا نام دنیا میں کچھ عرصے رہیگا اور تیری ذات سے بہتوں کو بھلا ہوگا۔ (پس) تجھے چاہیے کہ میری وفات کے بعد فلاں شہر میں فلاں بزرگ کے پاس چلا جائے اور کچھ عرصے ان کی صحبت شریف میں بیٹھے تا کہ تجھ کو ذوقِ وجدانی سے تعلق ہو جائے اور پھر تجھے اس تعلقِ جذبی کی کہ ہم سے تجھ کو ملا ہے، قدر معلوم ہوگی۔ اور ہمارا یہ طریقہ جذبی تیرے لیے اس وقت انتہائی فائدہ مند ہوگا۔ چنانچہ اپنے شیخ کے وصال کے بعد میں نے ان کی وصیت پر عمل کرنا چاہا (لیکن) عقل اس کی اجازت نہیں دیتی تھی اور کہتی تھی کہ کوئی طریقہ مشاہدہ و مراقبۂ بے رنگی سے بہتر نہیں۔ پریشاں خاطر نہ ہو اور اپنے آپ کو خوار مت کر جس قدر بھی ہو سکے اسی طریقے پر گامزن اور دن رات اِسی طریقے میں مشغول رہ۔ چنانچہ اس عاجز نے جو عرض کیا عقل نے تعمیل کی اور تقریباً بارہ سال مراقبہ و مشاہدہ بے رنگی

میں مصروف رہا۔ اور اکثر تہجد کی نماز کے بعد آنکھ کھول کر مشاہدہ کرتا تھا اور نماز صبح تک پلک نہیں جھپکتا تھا۔ ایک پہر یا اس سے کچھ زیادہ اسی طرح مشاہدہ کیا کرتا تھا اور خلوت وجلوت ہمیشہ اپنی نظر ہوا میں جمائے رکھتا اور جب کبھی فرصت بہم ہوتی تو ایک پہر یا ڈیڑھ پہر مراقبہ کیا کرتا۔ بالآخر میرا مشاہدہ اس حد پر پہنچ گیا کہ انوارات صاف ہو کر آئینہ کی طرح محسوس ہونے لگے اور مراقبہ بھی اسی منزل پر آپہنچا۔ جہاں تک بھی نگاہ پہنچتی تو سوائے ایک لطیف میدان کے اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ اور اگر کبھی کبھی (صورِ مثالی) مثالی صورتیں آجاتیں تو میں ان کو دفع کر دیتا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا حیرت مذموم حاصل ہو جاتی اور اس کے علاوہ سلطان الاذکار بھی کیا کرتا تھا۔ اور سلطان الاذکار میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ انسانی آواز بھی آنے لگی تھی اور جو کچھ کہ میں سنتا تھا ہو بہو اس دنیا میں ویسا ہی ہوتا تھا لیکن جو میری دلی خواہش تھی وہ باوجود کوشش کے حاصل نہ ہوتی تھی۔ بالآخر مجبور ہو کر اپنے شیخ کی وصیت کے مطابق میں نے سفر کا ارادہ کر لیا۔ (لیکن) ان دنوں میں میرا دایاں پاؤں اور بایاں ہاتھ بے کار ہو چکے تھے اور گٹھیا کا درد حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ میں نے دل میں کہا یا تو میں مر جاؤں گا یا اپنی مراد حاصل کروں گا۔ سو ارادہ سفر کر کے روانہ ہو گیا۔ تین آدمی (بمشکل) مجھے پالکی میں سوار کراتے اور اِسی طرح اتارا کرتے تھے۔ خدا کے فضل سے اس شہر کے جس کی مسافت ایک ماہ کی تھی ان بزرگ کی خدمت میں پہنچا اور انہوں نے مجھے قبول (بھی) فرمایا۔ چونکہ اس راہ میں بارہ سال گزار کے میں نے اِس (عمل) کا ارادہ کیا تھا ان بزرگ کی صحبت کی کیفیات کا اثر جلد ہی نمایاں ہو گیا۔ ابھی چھٹا دن ہی تھا کہ یہ تعلق حد سے زیادہ ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ واپس لوٹ جاؤں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ کچھ عرصے (اور) میری صحبت میں رہو کہ یہ کیفیت تمہاری ملکیت بن جائے۔ چنانچہ ان بزرگ کی صحبت سے میں نے چار ماہ اور بڑے فیض حاصل کیے۔ اس کے بعد اپنے گھر واپس آیا اور ایک سال تک اسی نسبت میں محو رہا اور پھر ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور (مزید)

ڈیڑھ ماہ ان کی صحبت میں رہا اور (بالآخر) اپنا مقصود پا لیا۔ اب بیس سال ہو گئے ہیں کہ اسی نسبت جذبی کے فیض سے بلا ارادہ وتکلف عالم بے رنگی میں محو وفنا ہو جاتا ہوں۔ دوسرے احوال تحریر کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا کہ کسی کو کوئی اور گمان نہ ہو جائے۔ اس سبب اتنے پر ہی میں نے اکتفا کیا ہے۔ بے رنگی وجذب کی یہی حد ہے۔ بے رنگی کی کیفیت کو جذب کہتے ہیں۔ لیکن بے رنگی کے طریقے سے جذب حاصل نہیں ہوتا تاوقتے کہ (کسی) صاحب جذب کی صحبت نہ ہو اور جب یہ دونوں احوال جمع ہو جائیں تو ایسی کیفیات مرتب ہوتی ہیں جو تحریر میں نہیں آ سکتیں۔ اور ان کیفیات کے حامل ایک شخص کا احوال کہ جس سے یہ فقیر پورے طور پر واقف تھا لکھتا ہے۔ یہ شخص ایک مہینے میں دو تین بار فنائے کلی سے دوچار ہوتا ہے اور اس حالت میں اس کو کبھی تو پورے ایک دن اور کبھی چار پہر، کبھی دو پہر اور کبھی ایک پہر بالکل اپنی خبر نہیں ہوتی۔ اور تصوراً اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا ہے۔ دینی اور دنیاوی کاروبار وہ (دوسرا شخص) کرتا ہے۔ اس وقت وہ معاملات دنیا کہ جو مطابق عقل ہیں اس دوسرے شخص سے وارد ہوتے ہیں۔ لیکن کسی شخص کو یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ یہ شخص (جس سے یہ اعمال سرزد ہو رہے ہیں) فنا ہو چکا ہے اور اس کا وجود درمیان نہیں بلکہ اکثر لوگ اس کو بڑا عاقل (وزیرک) سمجھتے ہیں۔ مثلاً اگر اس سے کسی واقعے کے بارے میں پوچھا اور کہا جائے کہ تو نے یہ کیا تھا میں نے اس طرح کیا ہے۔ تو وہ اپنے ہوش بحال کر کے سوال کے مطابق درست جواب دیتا ہے اور واقع شدہ امور کو جانتا ہے اور جس وقت اپنے آپ میں (واپس) آتا ہے تو سوزش و بے قراری اور دوسری واردات وتجلیات سے مملو ہوتا ہے اور وہ کیفیت اس کے اختیار میں نہیں ہوتی اور کبھی کبھی اس پر حیرت محمود بھی طاری ہوتی ہے۔ اور فنائے استغراقی کی طرح یہ اس کا ایک قدرتی پہر ہوتا ہے۔ حیرت محمود یہ ہے کہ قلب میں ایک ایسا جوش وکیف پیدا ہو جاتا ہے کہ اس سے (دوسرے تمام) ذوق ولذتیں مٹ جاتی ہیں اور دنیا ومافیہا میں اس لذت سے بڑھ کر کوئی اور لذت نہیں اور (یہ لذت) انوارات وتجلیاتِ ذات کے

مشاہدے سے اس شخص کو فنا کر دیتی ہے اور جب یہ شخص (بے خودی سے) اپنے آپ میں واپس آجاتا ہے تو اس کو عالم خودی کی ایک کیفیت ولذت وشور انگیزی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور حیرت مذموم یہ ہے کہ (یہ شخص۔ یا سالک) افیون کی پینک کی طرح بے ذوق ووجدان فنا ہو جاتا ہے اور جب عالم خودی میں واپس آتا ہے اس کے قلب میں کوئی یافت نہیں ہوتی۔ اور سوائے اس فنائے نسبت جذبی کے بے رنگی کے مشاہدے اور مراقبے میں اور کچھ نہیں۔ یہ سب اس شخص کا احوال تھا جو میں نے لکھا۔ باقی اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے۔

رباعی: ہو جس میں کہ یافت، ہے وہ حیرت محمود
مذموم ہے ہو شہود جس میں نہ کشود
ہر چند کہ اس کی دید غمگیں ہے محال
ممکن نہیں پر سوا ہو اس کے مشہود

میرے مشفق ایک تازہ موضوع پر کہی گئی رباعی آپ کی داد کے لئے خدمت گرامی میں ارسال کی جاتی ہے۔

رباعی: کر ظن نہ کچھ اس شرابِ ربانی پر
مت کبر کر اپنے زہدِ نفسانی پر
گر کفر دوئی نہیں تجھے اے زاہد
قشقہ بہ کبود کیوں ہے پیشانی پر

☆☆☆

خط۔۳

اے میرے مشفق جناب کا گرامی نامہ عین انتظار میں ورود کا چہرۂ تاباں لیے خاطر غمگین کے لیے باعثِ فرحت ہوا۔ تحریر سے آگاہی ہوئی۔ وہ جو سابقہ مکتوب میں آپ نے اعیان ثابتہ کے بیان کے بعد فرمایا تھا کہ تصوف کے ضمن میں اطمینانِ کلی حاصل ہو گیا (ہے) (تو یہ بتاتا چلوں) کہ جناب کو علم تصوف پر پوری قدرت ہے اور آپ کی اس دست رس کے بارے میں بعض خوش کن مکتوبات سے آگاہی ہوئی تھی۔ علم تصوف پر دسترس علما ظاہری کو نہیں ہوتی اور علم اللہ کسی شخص کو حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ بے کنار ہے اور دوسرے اس سبب سے بھی کہ ایمان کے بارے میں قول ہستی وہم پر مبنی ہے۔ اے میرے مشفق اعیان (اشیا کی اصل حقیقت) عینِ ذاتِ (حق) ہیں اور عینیت کے واسطے ذات، (حق) سے ان کی علیحدگی ناممکن ہے۔ پس ان اعیان کو کہ علم حق میں ثابت (جیسا کہ وہ ہیں) اور اس کی ذات سے عین ذات ہیں ایسے وجود وہمی سے کہ محض اعتباری ہے کیا تعلق ونسبت۔ اور اس وجود کی نفی سے اور اس امر سے کہ اس کا وجود ہی نہیں، کیا فائدہ۔ اور حضرت امام حسینؑ نے صرف اعیان ہی فرمایا ہے اور اگر ان اعیان سے ممکنات بھی مراد لیں تو درست ہوگا۔ اور یہ اس لیے کہ ممکنات نے وجود کی بو نہیں سونگھی ہے اور یہ وجود کہ ہے (دراصل) وجود نہیں رکھتا اور وہ جو جناب عالی نے اعیان ثابتہ (کا ہونا) شعاعِ آفتاب کے خطوط اور سمندر کی موجوں سے لکھا ہے، مجھے مناسب نہیں معلوم ہوتا اور وہ اس لیے کہ آفتابی شعاعوں کے خطوط اور موجوں کو تو ہر دم تغیر رہتا ہے باوجود اس کے کہ اصل کی حیثیت سے عین آفتاب وعین بحر ہیں۔ البتہ اگر آپ اعیانِ ممکنات کو خطوطِ شعاعی اور موجوں سے مشابہ کریں تو جائز ہے۔ وہ اس لیے کہ عیان ثابتہ کے قیام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی کہ کبھی ایک طرح ہوں اور کبھی دوسری طرح۔ اس کے برخلاف امواج وخطوطِ شعاعی کا مقام بدلتا رہتا ہے اور اعیان ممکنات برخلاف اعیان ثابتہ کے کہ عین ذات ہیں ہمیشہ متغیر رہتے ہیں۔ اسی لئے کہ ذاتِ (مطلق) تغیر سے عاری

ہے اور اسی لیے اعیان ثابتہ تغیر سے مبرّا ہیں۔ اور اے میرے مشفق، خطوطِ شعاعی، بصارت کے زائل ہو جانے پر ایک ہو جاتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو کہ جو مشاہدۂ آفتاب کرتے ہیں اور بظاہر اس میں مشاق بھی نظر آتے ہیں، ان کو تو خطوط شعاعی سرے سے نظر ہی نہیں آتے۔ چنانچہ ہم نے بھی ابتدا میں دو سال تک یہ ریاضت کی ہے۔ اور وہ جو آپ نے تحریر فرمایا ہے وہی عین ثابت زید ہے جو وجود مطلق میں موجود ہے۔ اور میرے کرم فرما وجود مطلق تعین سے عبارت ہے اور اس میں سارے اعتبارات و تعینات و تعلقات مٹ جاتے ہیں۔ اس مرتبے پر صفت کا کوئی ظہور (باوجود ے کہ) نہیں رہتا باوجود ے کہ تمام اسماً و صفات و تعینات عین لاتعین ہیں۔ البتہ وحدت کی منزل پر اعیان ثابتہ مسلم و ثابت ہیں۔ اور وہ لوگ جو علم تصوف میں کچھ درک رکھتے ہیں وہ وجودِ مطلق کو فی نفسہ مقام اعیان ثابتہ نہیں کہتے اور مانتے ہیں کہ اعیان ثابتہ و (محذوف) تعیناتِ عینِ وجودِ مطلق ہیں۔ اور تصوف کی تین چار کتابوں میں اس عبارت "ماشامت الاعیان رائحة الوجود" ترجمہ: اعیان نے وجود (مطلق) کی خوشبو نہیں سونگھی۔ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ لیکن کسی نے اس قول کو حضرت حسین علیہ السلام سے منسوب نہیں کیا۔ اور مولانا عبدالرحمٰن جامی نے بھی اپنی کتاب "مراتب ستہ" میں یہ بات نقل کی ہے۔ لیکن اس قول کو تجلیاتِ امام علیہ السلام سے تقویت نہیں دی لیکن رسالۂ "معرفت الفقر" میں کہ مجھ، فقیر کی رائے میں زیادہ قابلِ اعتبار ہے، مذکورہ قول باب ممکنات میں رکھا گیا ہے۔ لیکن امام علیہ السلام کی سند کے بغیر اور وہ عبارت آپ کے ملاحظے کے لیے تحریر کی جاتی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے۔ "وجودِ مطلق وجود واجب سے عبارت ہے۔ چونکہ وجود، واجب پر ہی لازم آتا ہے۔ ورنہ موجود کا انحصار ممکن پر ضروری ہو جاتا ہے، اور (پھر) اس اندازے پر نہیں رہتا۔ کوئی ممکن اپنے وجود کے اندر مستقل نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے وجود میں بھی وجود واجب کا محتاج ہوتا ہے اور وہ ظاہر ہے۔ وہ غیر کی ایجاد پر قادر نہیں۔ اور یہ اس لیے کہ ایجاد کا مرتبہ وجود کے بعد کا ہے۔ جب کبھی کہ ممکن کا حقیقت میں وجود نہ ہو تو ایجاد اس سے

صادر نہیں ہوسکتی۔ پس ممکن کا وجود نہیں ہوتا نہ اپنی ذات کے ذریعے نہ غیر کے واسطے سے ''لان الاعیان ماشامت رائحة الوجود فاذن ثبت وجود الواجب لان اصل الاذوات مبدأ الموجودات'' ترجمہ: اس لئے کہ اعیان نے وجود کی خوشبو نہیں سونگھی۔ پس ثابت ہوا کہ وجود صرف واجب (اللہ تعالی) ہی کا ہے اس لیے کہ وہی اصل ذات مبدأ موجودات ہے۔ اور تحقیق کی رو سے جناب عالی کی خدمت میں تحریر کرتا ہوں کہ میں نے تین چار معتبر کتابوں میں اس قول کو ''ماشامت الاعیان رائحة الوجود'' دیکھا ہے لیکن کسی نے امام علیہ السلام کی سند سے اس قول کو نہیں لکھا بلکہ خود امام علیہ السلام کی تصنیف بنام ''مراۃ العارفین'' کہ حضرت زین العابدین کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، میں نے یہ دیکھا ہے کہ ذکرِ اعیان ثابتہ ضمناً واقع نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کو (یہ کہہ کر) دردسر دے رہا ہوں کہ اگر وہ قول مستند ہے اور اگر کسی شخص کے ذریعے کوئی قابلِ اعتبار کتاب مل جائے تو مجھے (ضرور) مطلع فرمائیں کہ میرے پاس دستاویزی (ثبوت) آ جائے۔ تو میرے مشفق (اس بات میں) جو میری تحقیق تھی وہ میں نے تحریر کر دی۔ دوسرے یہ کہ اب آپ کو اختیار ہے (مانیں یا نا مانیں) (اب یہ) کہ سابقہ خط میں میں نے لکھا تھا کہ یہ دوستانہ خط و کتابت جاری رہے گی لیکن تصوف کے موضوع پر گفتگو صرف ملاقات پر موقوف ہوگی۔ چنانچہ جس قدر لکھ چکا ہوں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اور وہ جو میں نے اپنے سابقہ خط میں لکھا تھا کہ جناب کو مجھ سے نہ کوئی دینی غرض ہے اور نہ دنیوی بلکہ (آپ) خدا واسطے کی محبت کرتے ہیں تو وہاں دینی اور دنیاوی غرض سے مراد ہے کہ آپ مجھ سے کوئی غرض کا تعلق نہیں رکھتے۔ اور ہر وہ شخص کہ بے رنگی کے درجے پر ہے بے غرض ہی ہوتا ہے بجز ان لوازم بے رنگی کے کہ ذاتی محبت کے ذیل میں آتے ہیں اور وہ ہوا (ہی) کرتے ہیں۔ (مزید) یہ کہ بے رنگی جب کسی کو آ گھیرتی ہے تو وہ آزاد (ہو جاتا ہے) اور اس کو لوگوں کے اچھا یا برا کہنے کی پروا نہیں ہوتی۔ اور یہ اس وجہ سے کہ اس کے نزدیک خلق کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ پس اگر دوست اچھا

کہے یا برا، سب پسندیدہ ہے۔ اور اس کے برخلاف بعض آزادان (بے رنگی) محبت و سکر و فنا کے غلبے کی ابتدا میں شراب نوشی بھی کرتے رہے ہیں اور منزل مقصود پر پہنچ جانے کے بعد (انہوں نے) مراجعت کی ہے۔ (چنانچہ) اے میرے مشفق مجھے بھی آپ کی یہ آزادہ روی بہت اچھی لگتی ہے اور (عام) لوگ جو آپ کا احوال بیان کرتے ہیں تو وہ سارے آپ کے اس رویے سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ (لیکن) مجھے آپ کا یہ انداز اچھا لگتا ہے اور اسی سبب آپ سے ملاقات کا خواہش مند بھی ہوں کہ ایسا شہ باز اگر ہمارے جال میں پھنس جائے تو وہ (اپنے طور پر) عنقا سے کم کسی کے شکار پر مائل نہ ہوگا۔ اور (آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ) شاہ جہان آباد (دلی) میں ہزاروں (صاحب مرتبہ) اشخاص ہیں۔ نہ ان کو مجھ سے کوئی سروکار اور نہ مجھے ان سے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ ان کو بڑی داڑھی، کتری ہوئی لبیں ہزر دانہ تسبیح اور فراخ پیشانی پسند ہے (اور میرے مسلک میں) یہاں یہ چیزیں پائی ہی نہیں جاتیں اور مجھے جناب کا طریقہ کار زیادہ پسند ہے۔ خدا آپ کو رہین بے رنگی کرے۔ اور جب ہماری آپ کی ملاقات ہوگی تو میں بھی بے تائید بے رنگی ہی کرونگا۔ یہ طریقہ مجھے پسند ہے (کہ) اندر سے دوست اور باہر سے بیگانہ۔ دنیا میں ایسی پسندیدہ روش کے لوگ کم ہی پائے جاتے ہیں۔

دیوان رباعیات تیار ہو جانے پر انشاء اللہ ملاقات کے وقت پیش کیا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کو پڑھ کر آپ عش عش کر اٹھیں گے۔ میرے مشفق، ملاقات کے بغیر آپ کے دل میں میری کوئی وقعت نہیں اور وہ اس لیے کہ آپ کی فکر مختلف ہے اور میرے احوال مختلف۔ خدا کرے کہ آپ کو فرنگستان (اجنبیت) سے رہائی نصیب ہو اور میرے ہم خیال ہو جائیں اور جو آپ کے دل میں ہے ظہور پذیر ہو۔ اے میرے مشفق ایک اور مادۂ تاریخ بغیر تعمیہ کے ذہن میں آیا ہے۔ امید ہے کہ اس کو ملاحظہ کر کے مجھے ان میں سے جو بہتر ہے اس سے آگاہ کرینگے تا کہ دیوان میں اسی کو تحریر کیا جائے۔

قطعۂ تاریخ (مکان جان صاحب)

بنا کرد چوں جان صاحب، مکان
بشد فکرِ تاریخ برمن ادق

ترجمہ: جب جان صاحب نے مکان کی بنیاد رکھی
مجھ پر فکرِ تاریخ بڑی مشکل ہو گئی

ندا از سر عقل آمد بہ دل
مکان قلندر بود عرشِ حق

ترجمہ: عقل کی جانب سے دل میں یہ آواز آئی
قلندر (جان صاحب کا تخلص) کا مکان بھی عرشِ حق ہوتا ہے۔

دیگر

بنا کرد چوں جان صاحب مکان
بشد فکر تاریخ غمگین ادق

ترجمہ: جب جان صاحب نے مکان کی بنیاد ڈالی
تو (اے) غمگیں فکر تاریخ بہت مشکل ہو گئی

ندا آمد از غیب جاں (مصرع مکمل نہیں معلوم ہوتا ہے)
مقام قلندر بود عرش حق

ترجمہ: (اے) جان غیب سے یہ آواز آئی
قلندر (جان صاحب کا تخلص) کا مکان (بھی) عرشِ حق ہوتا ہے۔

☆☆☆

خط۔۴

اے میرے مشفق! میں نے حضرت امیر علیہ السلام کی تفضیل کے ضمن میں آپ کی تحقیق سے آگاہی چاہی تھی امامت وخلافت کے بارے میں نہیں۔ آپ نے تو ان کو خلافت ہی سے معزول کر دیا۔ پہلے اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں اس کے بعد کچھ تحریر کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ جناب عالی کو خلافت و امامت کے حقیقی معنی سے آگاہی نہ ہو۔ اس لئے کہ آپ امیر علیہ السلام کو صرف امام جانتے ہیں خلیفہ نہیں سمجھتے۔ یہ (عقیدہ) مذہب جناب ہی کی اختراع ہے۔ ہر چند کہ میں جانتا ہوں کہ آپ اپنی رائے سے انحراف نہیں کرینگے لیکن چونکہ یہ عاجز آپ کا دوست ہے مجھ پر لازم ہے کہ سچی بات ہی لکھوں۔ آپ نے جو خلافت کو سلطنت پر محمول فرمایا ہے تو یہ غلط ہے۔ اب سلطنت اور خلافت کی حقیقت کو رسول پاکؐ کی اس حدیث سے سمجھنا چاہیے۔ الخلافة بعدی ثلثون سنة ستروں ملکاً عضوضاً ترجمہ: ''میرے بعد خلافت تیس سال ہے۔ (اس کے بعد) تم تخت گیر بادشاہ دیکھو گے۔'' پس اگر خلافت سلطنت کی طرح ہوتی تو آنحضرت صلعم نے ''ملک عضوض'' نہ فرمایا ہوتا۔ اور دوسری بات یہ کہ آپ نے خلافت کو قضا پر حقارت کے ساتھ محمول کیا ہے۔ جب کہ قضا کا مرتبہ یہ ہے کہ رسول پاک کی حدیثوں میں حضرت علی مرتضیٰؑ کے حق میں ایک حدیث ''اقضھم علیؑ'' موجود ہے۔ یعنی ساری امت میں 'اقضیٰ' (سب سے زیادہ بہتر فیصلہ کرنیوالا) حضرت علیؑ ہے۔ پس حدیث کے مطابق ان ہی (خلافتِ راشدہ) کے تیس سالوں میں حضرت علیؑ نے چھ سال خلافت کی اور داخل خلافت رہے۔ اب ان کو صرف امام قرار دینے کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ (اصل میں) جناب اب تک خلافت کے معنی ہی سمجھ نہیں پائے ہیں (اور نہیں جانتے) کہ خلافت کیا چیز ہے۔ (خلافت) نہ قضا ہے اور نہ سلطنت بلکہ قضا و سلطنت خود بھی خلافت ہی میں شامل ہیں۔ اور صاحب فتوحات (یعنی فتوحاتِ مکیہ کے مصنف ابنِ عربی) کے

بقول انواع چہارگانہ میں ایک خاتم بھی ہے۔ اس میں خاتم نوع اوّل کہ جس میں صوری و معنوی اور خلافت سب یکجا ہو گئے ہیں یہ سب حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو لکھا گیا ہے اور وہ اس لیے کہ یہ خلفائے راشدین کا حکم ہے۔ اور جناب عالی کا عقیدہ اس حدیث کے خلاف ہے۔''الخلافة بعدی ثلثون سنة قدمت بعلی'' ترجمہ''میرے بعد خلافت تیس سال اور تمام ہو گئی حضرت علیؑ پر'' اور اس خاتم کو خاتم کبیر کہتے ہیں۔ اور جناب عالی ''قدتمت بعلی'' کے ہوتے ہوئے حدیث کے خلاف بنی امیہ اور آل عباس کو خلیفہ گردانتے ہیں اور یہ یکسر غلط ہے چونکہ یہ سب ''ملک عضوض'' یعنی تخت گیر بادشاہ ہیں اور خلافت میں شامل نہیں ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا''**اِنّی جاعلٌ فی الارض خلیفة** ''ترجمہ: میں واقعی زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو جناب کے عقیدے کے مطابق بنی امیہ و آل عباس اور ان جیسوں سب کو خلیفہ تصور کر کے فرمایا تھا۔ چنانچہ:

''**اتجعل فیھا من یسفك الدمآء ونحنُ نسبّح بحمدك ونقدس لَك**'' ترجمہ: کیا تو بنائے گا (خلیفہ) ایسے کو (جو) فساد کرے گا (زمین میں) اور خون بہائے گا اور ہم تو تیری تسبیح و تقدس میں مصروف رہتے ہیں۔'' چنانچہ''**اِنّی اعلم مالا تعلمون** '' کا کوڑا نہیں لگا اور اگر عقل کام نہ کرتی ہو تو کسی عارف سے دریافت کر لیں کہ یہ چاروں اصحاب اس خلافت میں شریک تھے۔ اسی لیے تو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے''**اِنّی اعلم مالا تعلمون** '' کا اس حال میں کہ فرشتے خلافت کے معنی سمجھنے سے قاصر رہے آپ سے گلہ کرنا فضول ہے۔ اور جس طرح میں دو حدیثوں سے حضرت امیر علیہ السلام کی خلافت ثابت کرتا ہوں آپ نے ایک حدیث سے جناب امیر کی خلافت کی تردید فرمائی ہے۔ اور یہ جملہ جو آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت علی نے خود دیگر تین خلفاء کو امور قضا سونپ دیے تھے اور جب کسی کو اس عہدے کے لائق نہ دیکھا تو خود اپنے ہاتھ میں لے لیا، کسی کتاب میں نہیں دیکھا

گیا۔ ممکن ہے فرقہ روافض کی کتابوں میں ہو۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مسلمانوں کے قضا کے فیصلے حضرت علی علیہ السلام کیا کرتے تھے اور حضرت عمر فرماتے تھے کہ جب تک یہ مرد دانا آپ لوگوں میں موجود ہے کوئی مسئلہ مجھ سے نہ پوچھے۔ میرے مشفق، آپ کی تحقیق عجیب ہے کہ آپ اعیان ثابتہ کو سمندر کی موجوں سے اور شعاعی خطوط کو آفتاب سے تشبیہ دیتے ہیں اور خلافت کو قضا و سلطنت سے۔ آپ نے جو کچھ بھی فرمایا ہے وہ صوفیہ و اہل سنت والجماعت کی کتابوں میں نہیں۔ (لیکن) آپ نے ان ماخذوں کا حوالہ بھی نہیں دیا جہاں سے یہ رائے نقل کی ہے۔ ہمارا مذہب (عقیدہ) قرآن شریف، حدیث نبوی اور اقوالِ صوفیہ کے مطابق ہے۔ اس کے خلاف جو بات ہے اس کو مستند نہیں مانتے بلکہ باطل گردانتے ہیں۔ اور یہ کیا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ کو کوئی خفیہ نہ مانے۔ اور جس طرح پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہماری مزید گفتگو بالمشافہ ملاقات پر مبنی ہے۔ چنانچہ جناب عالی محولہ حدیث کو پڑھ کر اس پر غور فرمائیں اور اس کے علاوہ تو جناب کے خط کے جواب میں خاموشی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ مزید آپ تحریر فرماتے ہیں کہ امامت یزدانی امر ہے۔ تو اس امر پر بھی غور فرمائیے کہ وہ کون سا امر ہے جو یزدانی نہیں ہے۔ اور امامت کی یہ تعریف جو آپ نے کی ہے کیا معنی رکھتی ہے۔ امامت و خلافت کی حقیقت تو عارفِ کامل کے علاوہ دوسرا کوئی کم ہی سمجھ سکتا ہے اور اگر پوچھی جائے تو مشکل پڑتی ہے۔ اللہ وہ دن (جلد) لائے کہ میری آپ کی ملاقات ہو اور ان سارے امور پر بالمشافہ گفتگو ہو سکے۔ خط نصف ملاقات ہوتا ہے۔ میرے اس خط کو اپنے (شہر) کے علما و فقرا کے سامنے پیش کریں (وہ) اس کو ملاحظہ کریں (اور دیکھیں کہ) کہ کون سا مسلک اچھا ہے اور کون سا برا۔ اور ہم کہ حضرت علی علیہ السلام کو فضیلت دیتے ہیں تو یہ کلام اللہ اور حدیث کے موافق ہے اپنے اختراع کردہ مذہب کے مطابق نہیں۔

میرے مشفق، اب اگر آپ جواب سینہ زوری سے دینگے تو مجھے قابل قبول نہیں۔ (ہاں

اگر اس کا جواب قرآن پاک وحدیث واقوال علما وصوفیہ ہو تب مجھے پسند آئے یا نہ آئے (ضروری نہیں)۔ البتہ میری خواہش یہی ہے کہ جواب قرآن پاک وحدیث کے مطابق ہو اور یہ اس وجہ سے کہ عقل سلیم وہی ہے جو قرآن پاک وحدیث کے عین مطابق ہو نہ کہ مخالف۔ چنانچہ اگر آپ کو جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کی تردید میں کوئی آیت قرآن وحدیث بہم نہ ہو سکے تو شوق سے تحریر کر دیں اور اس بحث کو ختم کریں اور وہ اس وجہ سے کہ ایسی باتوں اور بے سروپا تحریروں کا کوئی فائدہ نہیں۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ (۱۲۵۲)ھ ۸ مارچ ۲۰۱۱ء

☆☆☆

غالب کے فارسی خطوط

غمگینؔ کے نام

خط ۔ ۱

خط از طرف مرزا نوشه اسدالله خان غالب

بجناب حضرت صاحب دام بر کاتہم

قبلہ حاجات! آنچہ نخست دل را بہ نشاط تونگر کرد، دیدن روئے سید امانت علی بود سلمۂ اللّٰہ تعالی کہ دیدار، فروغ دیگر بخشید، چون از بار یا فتگان قدسی انجمن اند گرد سر شان گردیدم و کف پای بوسیدم، مشاہدۂ منشور آگہی کہ عبارت از نامۂ وَالا ست نورے دیگر افزود۔ غزل بہ ذریعۂ سید صاحب و فقیر صاحب فرستادہ آمد۔ مقارنِ آن آدم دیگر رسید وپروانۂ دیگر رسانید۔ شادمان شدم وعنوانِ دیوان رباعیات شادمان تر ساخت۔ سرمایۂ انم گو کہ آن مطالب عالیہ رانیک باز دانم وار کجا درخورِ آیم کہ آن ہمہ گہر بَرشتہ نگارش ازبہر من کشیدہ آید۔ وآنگاہ این مایۂ مکرمت کہ خود از بندۂ خود می پر سند کہ اگر دستوری دہی دیباچۂ را بنام تو نگار بندم۔ این پرسش خود ادائے نوازش دیگر است کہ زبان از اندرۂ سپاس آن بر نتابد۔ قبلہ گاھا! فضولی می کنم وچون فرمان چنین ست می گویم کہ گنجیدنِ نام من در آن نامہ نہ تنہا از بہر من بلکہ از بہر آبادئ من سرمایۂ نازشِ جاودانی ست، لیکن ہمہ آن، مرید خود رابیش از اندازہ دران نگارش نہ ستایند و کمترین بندۂ خود وانمایند کہ ہر آئنہ اندرین صورت ہم مدعائے خدام حاصل می شود و ہم خواہش این ننگ آفریش روائی می پذیرد۔ بالجملہ چشم بہ راہم کہ دیوانِ رباعیات کے می رسد و من بدان کے می رسم۔ فرمان چنان است کہ آن نوشتہِ را از نظرِ اغیار نہان دارم، ہم چنین خواہم کرد، اما کو غیر؟ پس از گذارشِ این بذلہ کہ المتہ

خلاف رای دانش آرای نخواہد بود۔ سخنے دیگر می گویم تا حضرت راذ وق و مرا اعتبار افزاید۔

بیتے ازبیت ہائے فقیر داخلِ صحیفۂ منتخب است۔

گر خامشی سے فائدہ اخفای حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

من خود فرمان پذیرفتم لیکن فرمان خرد اندرین باب آنست کہ ہر نگر ندہ بدیدن آن الفاظ بہ کُنہِ معنی نہ می تواند رسید و ہر کہ معنی رانیك تواند فہمید غیر نیست، چہ درین عالمِ تفرقہ حرم و دیر نیست۔ سخن ہائے دل آویز کہ گستاخانہ گزاردہ شد خاطر نشان و دل نشین باد۔ زیادہ حدِ ادب، عریضہ نگار اسداللہ، روزِ نگارش نامہ دہم ذی الحجہ، ہنگام شام، مشفقی سید حیدر علی صاحب اگر چنانکہ بامن می گفتہ رسیدہ باشند و سید پیر علی صاحب نیز سلام ہائے مشتاقانہ خوانند و مشتاق دانند فقط

(۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۴۱ء)

خط ۔ ۲

خط از طرف مرزا نوشه بجناب حضرت صاحب دام بر کاتہم

قبله و کعبه حضرت پیر و مرشد برحق مدظله العالی

شام گاه جمعه بیست و ہفتم محرم به غمکده تنها نشسته بودم و غیر من ہیچ کس در انجمن نه بود که ناگاه برقِ آگاہی درخشید و جمعه نام پیکے از در درآمد و نامۂ که کارنامه وحدتش توان گفت به من سپرد و مرا دگر باره از خود برد۔ گفتم وای عقده دیگر به کارم افتاد و ہولناک مقامے پیش آمد، چه من خود آن نخستین نامه را که در ڈاک به من رسیده است جز باروے اندیشه ساخته و به گرمیٔ آن گفتار چون شکر در آب گداخته ام۔ ہر چند می بایست که به پاسخ آن قدسی صحیفه دیده و دل بہم آمیختمے و به رنگا رنگ پوزش سخن انگیختمے لیکن یزدان داند که از جرأت خود آن مایه شرمسار بودم که ہرگز عذر نه توانستم کرد و جواب آن ہمایون منشور نه توانستم نوشت۔ این بار که نامه دیگر رسید بے قراری بر شرمساری افزود و خواسته و ناخواسته مرا بسخن آورد۔ بے بے، در عرض داشتے که از فضولی و فزون سری در عین و غیر سخن رانده ام پیش از شروع در مقصود عذر گستاخی خواسته ام وعرض کرده ام که این کلمه که غیر گو؟ بذلهٔ بیش نیست، ورنه سخن ہمان است که حضرت می دانند و من نیز بر آنم۔ والله آنچه درین ہر دو صحیفه نگاشتۂ کلکِ ہدایت رقم بوده است ہمه بجا وحق و ستوده است و اندیشۂ این ننگ آفرینش نیز بر خلاف آن نیست، امّا چه کنم که وقت از دست رفت و سخن بے خواست گفته آمد۔ ہمانا ذوق التفات پیر و مرشد و دولت آمد۔ سفینۂ رباعیات دل را آن چنان از جا بر انگیخت که از خود رفتم و در بے خودی سخنے گفتم۔ با این ہمه از حضرت پنہان نه خواہد بود که آن گفتار نه به طریقِ دعوی بود نه از راه سرکشی۔ خواستم که این بذله ذوق افزاید و

آں خود سرا به گرداب تشویر افگند۔ خوش گفت آں که گفت

ع یک لحظه غافل گشتم و صد ساله راهم دور شد

سوختن من به آتشِ اندوه از بهر آں است که اگرچه نخستیں نامه خاص مضمون ارشادِ هدایت داشت ام دومیں نامه از عتاب خبر دهد، ومن از ناتوانی طاقت تحملے نه دارم چناں که شاعر گوید:

شعر

ساتنک ظرفاں حریفِ ایں قدر سختی نه ایم
دانهٔ اشکیم کـه مارا گردشِ چشم آسیاست

آوازهٔ نه فرستادن رباعیات دور باشے است که دل را خون کند و رواں رافرساید۔ من و ایمان من۔ از روزے که بداں وعده گرامی شده ام کدام روز است که انتظارِ ورود سفینهٔ رباعیات نه می کشم و دل را بداں خیال شادماں نمی دارم، و ایں را خود همه کس می داند که نا اُمیدی بعد از اُمیدواری چه قدر جانکاه است۔ ناچار خود را خوار تر ازیں می خواهم و دست بسته عرض می کنم که چوں حضرت رباعیات را مسوده کرده اند هر آئینه کسے باید که آں را نقل تواند کرد و آنکه ایں کار تواند کرد، باید که خطے خوش داشته باشد و صحیح تو اند نوشت، چوں خطِ من هم بَد نیست و باشد که نسبت به دیگراں صحیح تر توانم نگاشت، چشم آں دارم که ایں خدمت به من مفوّض گردد، وآں اجزا به من فرستاده آید تا آں نقل کرده به خدمت فرستم و بر خود منت نهم۔ هم دریں نامه مرقوم است که شنوده ایم به تیزیٔ ذهن و رسائی خرد تاپایه تفضل حسین خاں رسیده ای۔ غرض می کنم که تفضل حسین خاں مردے بود به انواعِ علوم دانا که طب و نجوم و هیئت و هندسه نیک دانستے و در هر گونه علم سخن راندے۔ من که یک پارسی [داں] ناتمام چه گونه به پایهٔ وے توانم رسید۔ مطلعے و حسن مطلعے ازِ غزلِ خودم به یاد آمده است به حسب مناسبت مقام دریں ورق درج

سی کنم

دولت به غلط نه بود از سعی پشیمان شو

کافر نه توانی شد، ناچار مسلمان شو

زین هرزه روان گشتن قلزم نه توانی گشت

جوئ به خیابان رو، سیلی به بیابان شو

قبله و کعبه مرا خاطر نشان باد که من از هیچ کسانم و آن خس و خارم که هیچ نبررم و هیچ کار نیایم، اسلام را از من ننگ و کفر را از من عار، چنان که شاعر فرماید۔

براہ اُو چه در بازیم نے دینے نه دنیائے

دلے داریم واندوہے سرے داریم و سودائے

نه خردِ روشن نه فہمے درست، نه بختے مبارك، این قدر دانم که مرابه بے رنگی مائل کرده اند و قدرے از خود برده اند۔ انقسامِ وجود چنانکه عقیدۂ صورتیان ست باور ندارم که وجود واحد است و هرگز منقسم نگردد و تغیّر و تبدل بروے راہ نیابد، ومقابل وجود جز عدم نه تواند بود

عقل در اثبات وحدت خیره سی گردد چرا

هرچه جز هستی ست هیچ و هرچه جز حق باطل است

ماهمه عینِ خودیم اما خود از وهمِ دوئی

درمیان ما و غالب ما و غالب حائل است

حاصل خاکسار از هر گونه فکر و ذکر و ذوق یك فقره حضرت محی الدین عربی است که دل رابه سوئے خود کشیده است۔ الحق محسوسٌ والخلق معقولٌ و خلق عالم از زمین تا آسمان هرچه جز کیفیت واحد تصور نمایند. همه تعلق محض است، نغزسی گوید عبدالقادر بیدلؔ درین مقام۔

ما خیالاتِ عالم غیبیم گفتگوے جہان لاریبیم
کثرت آمد دلیل یکتائی که خیال وراست تنہائی

ایمان بندہ این ست و ما بقی اوہام۔ و درین عالم از قسم نبوت و ولایت و حشر ونشر و عذاب و ثواب ہر چہ بر شمارند ہمہ درست است و ایمان بندہ بہ وجود این ہمہ استوار۔ سبحان اللہ از آثارِ توجہ باطنی آن قبلہ خدا آگہان است کہ کلمہ از بیانِ معجز نشان جناب سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام بے خواست بہ یادم آمد حضرت می فرمایند۔

ماشاست الا عیان رائحۃ الوجود

یعنی اعیان شمتہ بوے وجود نہ شمیدہ اند، یک دوبیت از گفتۂ خود می نگارم:

چون پردۂ شب باز مصور بخیال است
این کارگۂ وہم ز پیدائی اشیا
اندیشد دو صد گل کدہ گل بردہ بہ دامن
امّا ہمہ از نقش و نگار پرِ عنقا
آئینہ بہ پیش نظر و جلوہ فراوان
دل پُر ہوس و صاحب خَلوت کدہ تنہا

ہر چند گذارش این حالات بحضور مرشد قدسی صفات از قبیل آن است کہ کسی سبوئے از آب بہ دریا آردو برگ گلے بہ گلستان فرستد لیکن مدعای این دردمند اظہار عقیدہ خود است تا آشکار گردد کہ صاحب این عقیدہ منکر ہیچ شے نمی باشد و ہمہ را بہ کیفیت واحد پذیرد ہم کفر و اسلام و ہم غیر۔ ہمہ بطربق تصوّر موجود است امّا نہ تصورے کہ ما کردہ باشیم، ازین تصور مقصود آن تصور است کہ سر آن کیفیت واحد را حاصل است و درین مقام سخت مناسب است تشبیہ بحرو موج و آفتاب و نور۔

میر صاحب مشفق سید امانت علی صاحب که از پرورش یافتگان حضور اند اکثر شب مرا می نوازند و چون خلوتے دست بهم می دهدسخن هائے راز گفته می شود، دو سه روز شده باشد که سخن در احاطهٔ بیرنگی آفتاد چون این رو سیاه درین روز ها به نظاره بیرنگی مبتلا ست اندرین باب مبالغه کردم و گفتم که بالا تر ازین پایهٔ نیست۔ میر سید امانت علی فرمودند که ترک این پایه نیز پایه دارد۔ گفتم مسلم اما این سخن گفتنی نیست، امرے ست که بعد افراط استغراق خود به خود حاصل می گردد و طریق حصول این پیهٔ همان بذل توجه ست در مشاهده بیرنگی نه این که بقصد از آن قطع نظر فرمایند۔ چه اندر آن صورت پیروی شیوهٔ عامه خواهد بود که گروه به گروه مردم غافل ازین اند حال آن که غفلت مردم ازین کیفیت در وجود آن کیفیت زیانی نمی رساند

ع دانـی هـمـه اُوسـت ورنـه دانـی هـمـه اُوسـت

خدا را توجه در آن بذل فرمایند و آنچنان صرف همت بکار برند که آویزش اندیشهٔ این مرید به بیرنگی افزون تر شود تا رفته رفته مستهلک و مستغرق گردم و از رنگ به بیرنگی و استهلاک استغراق دارم و عدم محض شده باشم، چون حضرت در منع ارسال رباعیات سر ر نشے به سزا فرمودند هر آئینه حیرانی بکار بردم و نهفته هائے ضمیر پراگنده خود را دیوانه وار آشکار کردم، اگر جرم من بخشیدنی ست نوید عفو تقصیر دهند تا از سر نو مسلمان گردم و به رحمت الهی ایمان تازه کنم، الله بس ماسوا هوس، نگاشته بست هشتم محرم (۱۲۵۵ه۔ ۱۸۴۱ م) روز شنبه هنگام چاشت۔ از اسد الله رو سیاه۔ میر صاحب مشفق سید حیدر علی صاحب سلام خوانندو خاکساری ها بر آن جناب پیرو مرشد عرض داشته سعی دران فرمایند که خطائے من بخشیده شود فقط۔

خط ـ ۳

از طرف مرزا نوشہ متخلص بغالب بخدمت جناب حضرت صاحب

حضرت پیر و مرشد برحق سلامت! بعد رسیدن طالع یار خان صاحب یک عرض داشت بتاریخ چہار دہم ربیع الاول روز سہ شنبہ بڈاک انگریزی رواں کردم و نامہ موسومہ میجر جان جاکوب صاحب بہادر نیز ——— روز آدینہ ہفدہم ربیع الاوّل فرمان گرامی و توقیع ہدایتی ازاں حضرت رسید و سرفرازم کرد۔ تازگی مضمون رباعی از خودم نبود، واللّٰہ اندیشۂ ہیچ سخنور بدیں نکتہ نہ رسیدہ ہیچ کس بریں مضمون دست نہ یافتہ، داغ پیشانی زہاد را بہ قشقہ کبود تشبیہ پاکیزہ و تازہ و دل پزیر است۔

کر ظن نہ کچھ اس شراب رمّانی پر
مت کبر کر اپنی زہدِ نفسانی پر
گر کفر دوئی نہیں تجھے اے زاہد
قشقہ یہ کبود کیوں ہے پیشانی پر

امّا این فقرہ کہ ''ما نہ عشق و محبت نوشتیم و تو آن را عتاب دانستی نہ مرا باما غرض دینی است نہ عرض دنیوی پس عتاب چرا کنم، فقط''، دل را، افسردہ و مرا نومید ساخت و خوابی نخواہی مرا بر آن آورد کہ سخن دراز کنم و آنچہ در دلست بزبان آورم۔ قبلہ و کعبہ، راستی آئین من است و محبت دین من، راستی را ایمان و دروغ را کفر می پندارم و بریں گفتہ یزداں را گواہ می آرم کہ ارادت و محبت من بحضرت ازاں افزوں تراست کہ آں را شرح تواں کرد۔ ہیچ گاہ عتاب حضرت بر خود گماں نکردہ ام و بطریقِ شکوہ سخن نہ راندہ ام۔ مگر احیاناً لفظ عتاب بر زبان رفتہ است، مقصود من از عتاب عنایت بودہ است چہ ہیچ کس با بیگانہ عتاب نہ کند، تا کسے را از خود

نشناسد عتاب نه فرماید۔ حضرت ہیچ گاه بر من عتاب روا نه داشته اند، و من خود آن کسم که به مثل مورد عتاب گردم چندان به نازم و فخر کم که دیگرے به عنایت نه کند، زیرا که عتاب و عنایت ہر دو نتیجۂ التفات است و محبت پیشگان را در ہر دو حال سپاس التفات لازم، اما انچه دربارۂ اغراض دینی و دنیوی فرموده لله الحمد که صفحه خاطر خاکسار ازین ہر دو نقش مُعّرا ست، جز محبت نه دین شناسم و نه دنیا تا آن که ہیچ کس و ناکس و نادانم لیکن این قدر دانم که وجود یکے است و ہر گز آن انقسام نه پزیرد، ہر آئینه اگر دینے و دنیائے تراشیده باشم، گرفتار شرك فی الوجود که اقبح انواع شرك است شده باشم۔ بدانست نامه نگار دین ہمچو دنیا نقش موہوم است و بوہم دل نتوان بست۔

زاهدا سامان پرستان راضی اند از ما که ما
خود شریك ہیچ کس در ہر دو عالم نیستیم
دشمنی خیزد ز شرکت تا به قصد دوستی
عاقبت گم کرده و دنیا طلب ہم نیستیم

دیں سه جویند گر دین مبارك و دنیا به دنیا طلبان ارزانی۔ مائیم و سواد الوجه فی الدارین که عبارت از نیستی محض است۔ ختم۔ انچه در باب ماشامت الاعیانُ رائحة الوجود فرو ریخته کلك مشکین رقم است حق حق و عین حق و محض حق است لیکن بخاك پائے حضرت سوگند که عقیدۂ این روسیاه نیز خلاف آن است و غلط نوشته ام، می دانم که اعیان ثابته مجعول بجعل جاعل نیستند۔ اعیان ثابته با وجود مطلق چون ہستی خطوط شعاعی است با آفتاب و چون نقوش امواج است با محیط، ہر آئینه وجود واحد است و وجود اعیان ثابته محض وجود واجب است، تعالی شانهٗ واین که امام علیه السلام می فرمایند که اعیان بوی وجود نشمیده اند این جا وجود عبارت ازین

ہستی موھومی است یعنی پیدائی و نمویش، و این خود ثابت است که تغیر بر واجب روانیست، پس مدعای امام آنست که اعیان ثابتہ ہیچ گاہ نمایش و ہمی نمی پذیرند و این نمایش محض توہم و باطل محض است و این انتقالات و توہمات و تنزلات ہمہ اعتباری است نہ حقیقی، از اعیان ثابتہ تا صور محشورہ ہر چہ از نمایش و پیدایش اند بہ سند ہمہ باطل است و ہیچگونہ تغیر روئے نداده و ہمان یک حالت است مثلاً جز از اجزائے آفرینش فردے را بہ بینند کہ از پشت پدر بہ شکم مادر رسید و پس از نہ ماہ بر زمین افتاد و سالے چند شیر خورده و انگاہ زبان بہ گفتن کشود و ہر گونہ سخن گفت و زید نام یافت۔ چون جوان شد نام بہ دانش بر آورد و علم آموخت و مردم را راہ راست نمود و بہ تند سال بدینگونہ زیست و آخر رنجور شد و بمرد و اورا بخاک سپردند و گنبدے بلند بر مزارش بر افراختند و حالیا آن گنبد را زیارت می کنند و ہر کس ہرچہ می جوید از مزارش می یابد۔ بالجملہ اینہا و صد چند مثل اینہا ہر چہ تصور کنند ما می گوئیم اینہمہ توہمات آشکارا بے بنیاد ست سرتا سر، از روز نخوں نطفہ تا زمان سپرده شدن بخاک ہمان عین ثابتۂ زید است کہ در وجود مطلق ثابت است ہر گز نمایش نہ پذیرفتہ و ہرگز معدوم نشدہ و ہر گز بہ نمود نخواہد آمد و ہر گز نہان نخواہد شد، و این زادن و بودن و گفتن و شنودن و زیستن و مردن ہمہ حقیقت عین ثابتۂ زید است کہ ہمواره دروے موجود است و خواہد بود و این مَثَل کہ گفتہ آمد نہ تنہا از بہر نوع بشری است بلکہ انجم و افلاک و عرش و کرسی و شجر و حجر حتی کہ زمان و مکان نیز ہمین حال دارند، فلک نیست عین ثابتہ آفتاب است کہ ہم چنان در حقیقی ذات با روشنی و درخشانی جلوہ گر، زمان نیست عین ثابتۂ زمانست بگونہ کون، اعتبارات وے امروز و فردا در ہستی مطلق شامل، از ازل تا ابد ہمان یک آن واحد است و از تحت الثری تا اوج عرش ہمان مکان واحد است و ثبوت ذات

واجب بدیہی و حقیقی است لیکن چون ذات واجب از تغیر و انتقال مصؤن و مامونست ہر آئینہ اعیان ثابتہ نیز بہ نمود و ہمی موجود نمی شوند و زوال نمی پذیرند۔ کوتاہی سخن، موجود نہ گشتن اعیانِ ثابتہ بدین معنی است کہ تغیر نہ بزیرند و از ذات منفک نشوند و ہموارہ از خود بر خود متجلّی باشند، چون اینست چہ ضرور است کہ اعیان را بہ معنی ممکنات شماریم، آرے از اعیان اعیان ثابتہ مقصود است و از وجود نمایش و استحالۂ و تنزل، و اگر از وجود ہستی محض فرا گیریم البتہ در ان صورت اعیان را جز بہ معنی ممکنات نخواہیم دانست، و ہر گز اعیان ثابتہ نخواہیم گفت زیرا کہ در آن صورت انکار وجود واجب لازم می آید۔ معاذ اللّٰہ من ھذا العقیدہ، چون سخن تا آنجا رسید خوشتر آن ست کہ حال خود را در مشاہدۂ نیرنگی نیز عرضہ دہم تا سبکدوش تر گردم۔

خدا یگان علام چشم بر ہوا اندوختہ بلکہ دل در نیرنگی بستہ است ہمین بحث اعیانِ ثابتہ کہ مذکور شد نظر گاہ است و سعیٔ من در آنست کہ بہ عدمیت اصلی خود باز گردم و زود گرد آیم، و نہ شغل و نہ ریاضت۔

۶ دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست

این قدر ہست کہ ہنوز وقت واہمہ مرا خار خارے باقیست و گاہ گاہ مرا از راہ می برد لیکن امیدواری دارم کہ بمن نگاہِ عنایتے کہ پیر و مرشد را برمن است از وسوسہ پاک گردم و در راہ فنا خاک گردم، قبلہ و کعبہ، نگارش حق گزارش ادا نمی تواند کرد و تحریر بمنزلہ تقریر نمی تواند شد، آرزومند آن روزم کہ بشرف قدم بوس مشرف شدہ باشم و درد دل بزبان گفتہ و ارشاد جناب عالی بگوش ہوش شنودہ باشم۔

این کہ ارشاد فرمودہ اند کہ از طرفِ تصوف ہم از تو اطمینان کلّی حاصل شد۔ جناب عالی۔ من مرد سپاہی زادہ، بے علم، جاہل، پدران من از ترکانِ صحرا

نشین بودند۔ بس اینست که یک دو مصرعه موزوں می کنم ویک دو بدله در ہر فن می گویم، مرابه تصوف چه پیوند و به درویشی چه نسبت، و الحال جز ایں قدر نیست که واحدیت وجود و عدمیت اشیا در حمیرم فرود آوردند و الحق محسوس والخلق معقول عقیده من ساخته اند، من می دانم که یکے ہست و جز او ہیچ نیست دیگر ہمت من از سعی و ریاضت و دولت و مال منحصر بریک دو پیمانه شراب که به شب در کشم و مست بخسپم نه دین دانم و نه دنیا، اللّٰہ بس ما سوا ہوس۔

خداوند نعمت سلامت، مرا در عزم سفر تابستان مانع نیست بے سر انجامی مانع نیست، خرقه به تن در افگنم و رواں گردم۔ لیکن مقدمه من بولایت رفته و دو سال کامل شده است، امید وارم که امروز یا فردا یا خود بعد ہفته دو ہفته یک ماه دو ماه حکم آں از ولایت برسد، رسیدن مقدمه ار ولایت ہماں و پوئیدن من بسوئے گوالیار ہماں، پیر و مرشد غلامے خریده آزادش نخواهند کرد که غلام وفادار است۔ زیاده ازیں چگویم که گفتن را شاید۔

از اسداللہ۔ نگاشته ہژدہم ربیع الاوّل (۱۲۵۵ھ)

روز شنبه ہنگام نیم روز

خط ۔ ۴

[یہ خط مطبوعہ کلیات نثر غالب (ص ۱۸۳۔۱۸۴) نول کشور پریس ۱۲۸۷ھ میں بھی موجود ہے]

خط مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب

بخدمت حضرت صاحب دام برکاتہم

در دل ز تمنائے قدم بوس تو شوریست
شوقست چہ نمک دادہ مذاق ادبم را

جان بپائے قبۂ راستان افشاندن بہ دل گدرانم۔ اگر گستاخی نہ بود کعبۂ راہ روان را گرد سر گردیدن آرزو کنم، اگر ادب دستوری دہد رسیدن نامہ ہای دل آویز و شنیدن نکتہ ہای مہر انگیز کہ مرا بہ حجستگی بخت من اُمید واری می دہد، نرمس خجستہ تر بدہ۔ چوں در ان چشم و دلم جا دادہ اند اگر از اُوج گرائی سرم بہ سپہر ساید بجاست و اگر از خود نمائی جُز خودم در نظر نیاید رواست۔ طالع یار جان صاحب شمارۂ عنایت ہای آن محیط کرم و خود ار خودم ربودہ اند، و ارادت مرا چنداں کہ بشمر در نہ گنجد بر افزودہ، کیستم تا بدیں التفات ارزم و مرا در نکوئی ایں چنیں گران پایہ باشد کہ کس مرا تواند ستودہ و آررو مند دیدن من تواند بود و آنگاہ این چنین گران سایہ و والا پایہ کسے کہ گوہرش آبروے ہشت دریا ست و گلش رنگ و بوئے ہشت گلشن۔ شبلی با آں ہمہ قطع نظر ار ما سوی اللّٰہ در صومعہ بہ تمنائے قدوسش چشم براہ، و منصور بایںہمہ شور ترانہ انا الحق در ہنگامہ بہ آرزوئے گفتارش گوش بر آواز. سبحان اللّٰہ آنکہ تجلی طور بہ پروانگی شمع جمالش نازد یا من ارنی گوست و آنکہ دیدارش تاب ہر نظر نہ بود ار من دیدار جوست. چہ کنم عمرے است کہ ہمت من بہ کارے آویختہ و سر گرمی ذوق مطلبے شرر بہ پیراہنم ریختہ است و آن خود کارے است نازک و مطلبے است دشوار کہ ارین پیش سالے چند بہ محکمہ رزیڈنسی دھلی در کشا کش ماندہ و روز

گارے دراز در انجمن فرماندِ ہان کلکته پیچ و تاب خورده، اکنون دو سال است که آن داوری به کشور لندن رفته، و دراں داد گاه سنجیده می شود، تا پاسخے ازاں کشور و فرمانے ازاں داد گاه درنه رسد نمی توانم بر خود جنبید و از دہلی بدر رفت۔ می خواستم که پارۂ از حقیقت آن داوری بعرض رسانم۔ لیکن اگر بدیں پر داختمے سخن را از درازی سر رشته گم شدے و شنونده را گو ہر رار بکف نیامدے۔ بالجمله چشمم براہے و دلم بجائے است، و دریں کشمکش که درون و برون مرا درہم دارد، سفر نیارم کرد، اما دانم که روزگار انتظار سر آمده و ہنگام کشود کار درآمده است بر آنم و همه این می سنجم که چون حکمِ قطعِ خصومت از ولایت رسد زاں پس جز آن مایه مدت که بسر انجام ضروریاتِ سفر وفا تواند کرد، به دہلی نیارامم و روی به گوالیار نہم۔ و اگر روند گان به پائے روند من بسر پویم، اُمید که به پرورش یافتگان و زلهٔ ربایانِ مائدۂ فیضِ حضور فرمان شود که بوقت خاص مرا و کارِ مرا در خیال آورده ہمت بدان گمارند که به زودی کارِ من سره گردد و مراد بر آورده آید، تاپای راه پیمای من به خرامش کشاد پذیرد و جادۂ راه گوالیار پے سپر من گردد۔ نہفته مباد که پس از رسیدن طالع یار خاں صاحب بسه روز منشورے که سراسر رقم بحث رنگ و بیرنگی داشت از ڈاک بمن رسیده و ہمت را تعوید بارو گردیده است، و ہم چنین اُمید وارم که روزے چند پیش از رسیدن این عرضداشت سید امانت علی صاحب رسیده آداب نیاز بموقف قبول و غزل ہائے فارسی را به نظر التفات رسانده باشند۔ درین نزدیکی میجر صاحب عنایت فرما میجر جان جاکوب صاحب بہادر دوتا نامه بمضمون طلبِ تاریخِ تعمیرِ دولت کده برمن فرستاده اند۔ ورقے بجواب آن ہر دو مکتوب که مشتمل بر دو قطعه تاریخ است در نورد این پوزش فرستاده می شود، بعد مشاہده به مکتوب الیه داده شود، زیاده حدّ ادب۔ از اسد الله نگاشته چار دہم ربیع الاول ۱۲۵۵ ھ۔ بخدمت میر حیدر علی صاحب و میر امانت علی صاحب سلام نیاز رسیده باد، مکرمی حکیم رضی الدین حسن خاں صاحب که مرا به لطف و تفقّد می نوازند و درین غم زدگی شادی من بدیدار ایشانست سلام نیاز می رسانند و چون من از دیدار طلبا نند۔

خط ۔ ۵

خط مرزا نوشہ بجناب حضرت صاحب دام برکاتہم

حضرت رہنما سلامت! ہفدہم ربیع الاول روزِ جمعہ بعد از شام پیکے از در در آمد و والا نامہ بمن داد، چون پرسیدہ شد کہ کیستی و کے می روی گفت از نوکران نواب شاہ جی بودہ ام در دو سہ روز بہ گوالیار می روم، خاکسار فردای آن کہ شنبہ ہژدہم ربیع الاول بود کف بہ عریضہ نگاری کشود و درد دل در آن ورق سرود۔ تا امروز کہ یک شنبہ بست و ہفتم ماہ ست آن نامہ ہم چنان نزد من موجود و نامہ بر مفقود، تا این وقت کہ پاسے از روز باقی است بریدے از سر رشتہ ڈاک انگریزی نا گاہ رسید و توقیع از حضور و نامۂ از جان صاحب ہر دو نگاشتہ بست و سیوم ماہ بہ پیش نظر جلوہ گر کرد۔ ہمانا این ہر دو ورق از ہر دو جا بہ پاسخ آن نامہ بود کہ قطعہ تاریخ دران نگاشتہ بودم، بالجملہ چون رسیدن این ہمایون منشور شوق را تازگی داد و دل را از جا بر انگیخت گفتم انتظارِ آدم چرا۔ خوشتر آنست کہ عریضہ رقم کنم و بہ ڈاک فرستم۔ ہر چند این ورق ہم امروز می نگارم لیکن ہنگامِ ڈاک گذشتہ و روز سپری شدہ، فردا این عرضداشت روان خواہد شد۔ دو ورق نگاشتہ پیشین نیز باین ورق فرستادہ می آید و عرض کردہ می شود کہ بہ مزید التفات مشاہدہ فرمایند، و چون فرمان چنانست کہ زین سپس در نامہ جز شوق مضمونے نخواہد بود من ہم دل بدین شیوہ نہادہ ام و خوشتر ہمین دیدہ ام کہ در عرائض گفتار ہائے وحدت و کثرت درنیاید و این خود حوالہ بہنگام ملازمت باشد۔ و انشاء اللّٰہ کہ این مدعا ہر چہ زود تر بر آید۔ چنانکہ در ورق نخستین بعرض رسانیدہ ام مادہ تاریخ مکان جان صاحب قلندر کہ

حضرت اندیشیده اند چگویم که چه قدر خوب است و خوبی دیگر آن که همان نمک گفتگوی درویشانه موجود۔ و در تاریخ گنجائش این ها دشواری دارد۔ سخن بدین خواهش گو نه می کنم که در ان دو ورق که نوشته سابق بپایان تحریر یك فقره مرقوم است آن را بدل توان پزیر فت زیاده ادب۔

سید صاحبان الطاف نشان میر حیدر علی صاحب و میر امنت علی صاحب را از اسد اللّٰه رو سیاه معروض آنکه ماهم در زمرۂ شما در آمده و باشما خواجه تاشی گزیده ایم و خط غلامی به آقای شما داده ایم، امید که برشما گران نگزرد و شمول ما در سلك شما باعث ننگ و عار شما گران نگزرد و شمول ما در سلك شما باعث ننگ و عار شما نباشد، مکرر بحضور پیر و مرشد معروض آنکه چون فراهم آمدن احباب شامگاه معمول است و من همین وقت این نامه را می نویسم و تمام می کنم۔ لا جرم پیام حضور بطالع یار خان صاحب وقت شب خواهم رساند و رباعی بعالی خدمت جناب حکیم رضی الدین حسن خان صاحب نیز همان وقت خواهم خواند۔ پاسخها در عریضه آینده نوشته خواهد شد۔ ۲۸ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ

خط ۔ ۶

خط مرزا نوشہ بجناب حضرت صاحب دام برکاتہم

قبله و کعبه یگانه! سرمنائے خبر (؟) حقیقت واحده هیچ شے را موجود نه پندارند، روی نیاز هر سو که آرند چشم این طائفه برشمار حقیقت الحقائق در است و لا مؤثر فی الوجود الا اللہ و لا موجود الا اللہ عبارت از همین شور و گذار است، لاجرم هر گونه نیرے که می نگارم همین نیایش ایزدی است که درین پرده بجا می آرم۔ کافر باشم اگر هیچ گاه شکر و شکوه من از غیر بوده باشد تا خود این شکر و سپاس و شکوه و ستیزه و ستیزه را در طرح حق نگر وجودے بوده باشد، خوش گفت آنکه گفت۔

دریا بوجود خویش موجے دارد — خس پندارد که این کشاکش با اوست

حق اینست که آنچه ما می نگریم پنداشته نگریسته ایم، با خود آن نگریسته را شرح می کنیم، و رحم گفتگو همین است که هر شے را به ضد شناخته ایم، روز را شب و گرمی را سردی و هست را به نیست و روشن را به تاریک۔ بخاطر خطور نگردد که این سخن جسته در باب معرفت کبریای الٰهی می گوئیم۔ حاشا ثم حاشا در آن بارگاه نه ضد را گنجائی و نه مثل را پیدائی بلکه مقصود از نمود این قاعده اینست که در مقام پندار هستی که مجمعه فرو مانده آن ننگیم هرچه متصور آید لامحاله آن را طرف مقابلے خواهد بود۔ هر آئینه مقابل حق نیست الا باطل و مقابل وجود نیست الا العدم، و این نقل مقتضای سیاق سوق کلام است ورنه پیداست که باطل را با حق و عدم را با وجود چه شمار است، بالجمله مقابل حق نیست الا باطل و مقابل هست نیست [الا نیست] پس هرچه جز هستی است نیستی است و هرچه غیر موجود است عدم است، کُلُّ شیٍ هالکٌ الا وجهه که در کلام بے حروف و صوت واقع است اشاره هم بدین مقدمه و هالک

ـدان معنی نیست که کس گمان کند که اینهمه نمود های بے بود را پایان کار فنائے هست، بلکه غرض آنست اینها همه معدوم و در حدّ ذات مستحلك اندو این حالت آنچنانیست که به اقرار دانا و انکار نادان ثبوت و نفی آن لازم آید۔ چنانکه عارف می فرماید: "دانی همه اوست ورنه دانی همه اوست"۔ حضرت سلامت! صوفیه را سخن هست که دفتر ها ازان پُر است اگر مجموع این کتب یك جا کنند بار کاغذ فراهم آید۔ اما اصل آن همه گفتار ها آنچه گفته ام در دل نمی گذرد و این خلاصه دل نشین نمی گردد و تا دل از آغاز گداخته نباشد و آن را که این رمز بدل فرونیابد [به] بیابات سرگ ناکامی ماند و هر گز به مدعانه رسد و جز از اعمال تسخیر و ۔ و کشف نیند وخت و عمرش درین زخارف لاطائله بسر رفت، وآن را که چشم برین پایه کشودند و ضمیرش این اندیشه را چنانکه حق پزیرفتن است در پزیرفت دیگر به آلودگی نیا سیخت، ورند پارسا برآمد۔ من با اینهمه نارسائی و هیچمدانی که نه از علم بهره ورم ونه از عمل کامیاب، دُرد پیمانهٔ عالمم و ننگِ دوده بنی آدم۔ همدرین مرحله پایم بسنگ آمده است و شمار قدم تابدین جاده منتهی گردیده۔ دیگر ندانم که جهانیان چه می گویند و از بحث معرفت چهامی جویند۔ آن که به ترجمهٔ نثر دیباچهٔ دیوان فرمان رفته است چو منے را سرمایهٔ اینهمه شناخت کجا که بشرحِ این چنین نکته های سر بسته تواند پرداخت۔ آری این قدر هست که هر چه خواهم گفت اندیشه من از دائره من بیرون نخواهد رفت و خاطر و سوسه ناك من جز رجوع بعدمیت اصلی تسکین نخواهد یافت۔ هر چند انچه من در نظر دارم از مدارجِ کمال نیست، لیکن چگونه گویم که تا این و آں بخاطر جا گرفته است چه مایه لذّت می یابم و چه چشمه هائے نوش از هر سرِمویم جوش می زند۔ طوبی و سلسبیل خوشم و در هر نفس زدن صد کوثر بقدح در می کشم۔ چوں این سخن پایان ندارد ناچار به شهود می گرایم و مستانه افسانه سرمی کنم۔

کمترین نواز! درین روز گار دو تا نوازش نامه رسید و سرا در نظرم آبروبخشیده، افسردگی و ماندگی نگذاشت که پاسخ گرارده و عرضداشت نگاشته شود۔ اکنون که زخمه ریزی مضراب پرسش تیز آهنگ تر شد نواهای بلب نهفته ار پرده سربدر می زند، نخست سپاس تفقد و عنایت بتقدیم می رسد و انگاه معروض می گردد که مطاع مکرم و مخدوم معظم سند بدر الدین علی خان صاحب المشتهر به فقیر صاحب که اسد اللّٰہ را دل در بند مهرو وفای ایشانست بیشتر اوقات از راه لطف و کرم به کلبۂ احزان من می رسد۔ چون مطابق ارشاد والا ایشان را بسخن گرم کردم و سراپائے خاطر ایشان را بخیال پیمودم شخصے دیدم درد مند شکسته دل نا اُمید خونین جگر، هم ار غم مرگ برادر دلش ار صد جاچاک و هم از تنگی دل دست [بدامن[1]] خویشتن دراز: گاه ولولۂ و داغ وطن و الرامِ دوام غربت ار لب برون ریختے و گاه به گدازش ذوق ترك لباس دُود از مغز سخن بر انگیختے۔ آری در مانده زندان غم چکند و مبتلای درد تنهائی چرا ملول نباشد۔ چون دست من بجائے نمی رسد دمادم بر حال پریشان تاسف می خورم و سلامت ذات و درستی حالات ایشان از خدا مے خواهم۔ بالجمله بعد ار هزار گو نه گفتگو فقیر صاحب ممدوح رابر طلبِ مختار نامه مهری جناب راضی کرده ام و باشد که کاغذ اسٹامپ مع مسوده هبه نامه و مختار نامه بوالا خدمت بفرستند۔ ار رسیدن آن کاغذ را بمهر خود مزین ساخته عنایت می توان فرمود، و این نکته را نیز به ضمیر باید گرفت که برای آن قبله از فرزندان خود فقیر صاحب کمتر نیست۔ هر آئینه شفقتِ پدری ازان بے چاره دریغ نباید داشت و خاصه درحقِ این جزو آورینش مظهرِ آثار ربوبیت تو ان بود۔ زیاده جزاینکه هیچم بلکه نیستم چگویم۔ فقط۔ نگاشته غرّه ربیع الثانی روز دو شنبه ۱۲۵۵ ھ۔

---

[1] یہ لفظ بگریبان ہونا چاہیے۔

خط ۔ ۷

خط مرزا نوشه بجناب حضرت صاحب دام برکاتہم

قبلهٔ دیده و دل سلامت! می دانم و دل که فیض ورود والا نامهٔ نامی چه کرده.
بر آتشم آب زد و چراغ آگهی برافروخت، همانا آن قدسی صحیفه شمعے نموده
که روح به پروانگی آرزو کنم. چکنم فرصت تنگ است و گفتگو فراوان. آدینه
روز بیست و هفتم شعبان و هنگام بامداد است و من هنوز از انها که مبتلای آنم
فروغ نیافته ام. و آدم کمر به رهروی بسته رو بروے من نشسته است. آنچه در
دیوان فیض عنوان دیده، کافر باشم اگر در مثنوی مولوی روم و دیگر کتب
تصوف این ها دیده باشم، خاصه در رباعیات که هر کوزه دریائے و هر ذره آفتابے
دارد. و اگر حیات باقی است زین سپس حال رباعیات نگاشته خواهد شد. این قدر
بخاطر باشد که ما نیز برین جاده و بدین اندیشه دل نهاده ایم تا پایان کار از کدام
پرده سر بیرون آوریم و در کدامین گروه شمرده شویم. دیوان حال به مخدومی
مکرمی سید صدر الدین علی خان المشتهر به فقیر صاحب سپرده و دیوان سابق
ازیشان گرفته به آدم حضور باز داده شد. این نامه بدان روی که اندیشه برتابد
نگاشته می شود. در حقیقت پاسخ عنایت نامه هنوز نه نوشته ام. زیاده حد ادب،
مشفقی میر حیدر علی صاحب پس از سلام و[1] مطالعه فرمایند که پیر علی
صاحب درین روز ها به دهلی آمده بودند بعد عمرے ایشان را دیدم، امروز خود
شان به اکبر آباد روان شده اند، می گویند که ماه روزه در آگره بسر برده به گوالیار
می روم، اطلاعاً نوشته شد، عرضداشت اسد اللّٰه رو سیاه. فقط.

---

[1] معلوم ہوتا ہے متن میں حرفِ عطف 'و' رہ گیا ہے۔

خط۔۸

خط مرزا نوشہ بجناب حضرت صاحب دام اجلالہم

یزدان را سپاس گذارم و بدین ذوق خود را در نازم که مرا نه گوشه خاطر کسے جائے داده است که تا کام و زبان را بهنجد آب ننشویم نامش نتوانم برد۔ فروغِ کوکب سعادت، بهارِ باغ ادب، منبعِ فیوض نامتناهی، واسطهٔ حصول رحمت الٰهی، روشنی بدیرفتهٔ نور الانوار و راه یافتهٔ مقام جمع الجمع به رهنمائی ابدی و به راه بینی ازلی، مرشدی و مولائی و مخدومی حضرت میر سید علی که چون سپهر را نواخت و مخاطب ارزنده شناخت انا از انور بر اوج و که مهر بر خاکروبه ها تابد و از خس و خار را دریابد۔ فیض ورود صحیفهٔ قدسی خانها نه کالبد آگهی دمید و دیوان معجز بیان، دست آویز گران سنگی من گردید، خوشا من که نامه ازان خامه نزاود و رخے من که کلام قدسی بمن رسد۔ غزلها یک دست و نکته ها هموار، مضمون ها عارفانه، من و ایمان من که این زبان [سرسری[۱] یعنی اُردو در نامه حقیقت؟] بیش ازین برنتابد و هر گونه نظر این ادای خاص را در نیابد۔ من نیز دیده ور نیستم و تماشائے جمال این پریزادان معنی به[۲] اندازه می نمود. سواد همین اوراق سرمهٔ سلیمانی چشم اندر کشید که نگه بدین جلوه های نیرنگ آشنا شد۔ واماندگی صورت چه داند که این گوهر گفتار کجائی است و این گرد از کدامین کاروان می خیزد۔ قبله و کعبه مرا خاطر نشان باد که هر چند هم درین بقعه که دهلی نام دارد شبے شرف پابوس دریافته ام و آن را ذریعه رستگاری خویش می دانم، لیکن اینک برخود حیف می کنم که دران هنگام گوش هوش شنوا و چشم ادراک بینا نبود، تا از انچه اکنون بدل می خلد و اندیشه

---

۱ ان خطوط کے مرتبین نے قیاساً قوسین میں جو خانہ پُری کی ہے وہ درست نہیں معلوم ہوتی۔ (مترجم)

۲ معلوم ہوتا ہے کہ اصل متن میں لفظ 'به' رہ گیا ہے۔ یہاں "باندازهٔ من" ہونا چاہیے۔ (مترجم)

بدان آویخته است سخنے چند پر سید سے و کار آگہی ببالا بردسے، هم آتش شوق زبانه ور گشتے و هم چراغ شناخت را فروغ گستر آمدے۔ هر چند خرد سی سگالد و باور کرده ام که هستی جزیکے نیست اما بیشتر این نمود بے بود که نقش های برانگیختۂ پندار است به دل جاسی کند و خاطر از حوش و ناخوش برهم سی خورد۔ خدا را بر این نیم سوخته نظرے تا پاك بسوزد، و دود و شرار و خاکستر همه از نظر بر خیزد۔ دانم که آرزوی های دل به حوصلۂ ارزش من در نه گنجند، لیکن شنوده ام که مس به کیمیا زر سی گردد۔ زیاده ازین چه گویم که نامه برپا به رکاب است و مکرّمی سید بدر الدین علی خان فقیر صاحب در اضطراب۔ انشاء اللّٰه العظیم ازیں بعد نیاز نامه ها به والا خدمت خواهد رسید۔ مشفقی سید حیدر علی سلام خوانند و مشتاق دانند۔ محرر اسد اللّٰه۔ نگاشتۂ روز بست پنجم ذی الحجه هنگام شب۔ پیش چراغ (۱۲۵۵ ھ ۱۸۴۱ ع)۔

خط ۔ ۹

خط مرزا نوشه بجناب حضرت صاحب مد ظله العالی

حضرت پیر و مرشد برحق مدظله العالی

بسا روز ها به شب آمدو شبہا روز شد تا صبح دولت من بر اُفق اقبال دمید و منشور لا مع النور تعویذ بازوئ جان گردید۔ نامۂ موسومۂ طالع یار خان و حکیم قطب الدین خان هر دو به طالع یار خان سپرده شد و فرمانِ جناب علی رسانیده آمد۔ نامه که بنام نامی فقیر صاحب بود بخدمت شان رسید۔ اغلب که امروز یا فردا نزدِ من آیند تا پیام حضرت بزبان نیز گزارم۔ می میرم از رشک که دیگران آهنگ راه گوالیار دارند۔ مرا هنگامِ آن قرار نیامده است که از دام بدر توانم جست۔ یارب زود باشد که کام دل برآید و زمان انتظارِ حکم ولایت و روزگار هجران بسر آید۔ و این روز ها غزلے درمیان احباب طرح شده و دران زمین ده بیت گفته شده بود به چشم داشت اصلاح درین ورق نگارش می پذیرد۔ غزل:۔

در وصل دل آزاری اغیار ندانم   دانند که من دیده ز دیدار ندانم الخ

زیاده حدّ ادب، از اسد اللّٰه، نگاشته هژدهم رجب ۱۲۵۵ھ ۱۸۴۱ع۔

در همین روز ورودِ والا نامه سید حیدر علی صاحب و سید امانت علی صاحب سلام نیاز خوانند و مشتاق دانند۔ بندۂ شاه شمائیم و ثنا خوان شما۔ مکرمی جناب حکیم رضی الدین حسن خان بو الا خدمت حضرت صاحب مراسم تسلیم و آداب می رسانند فقط۔

خط ۔۱۰

خط مرزا نوشه بجناب حضرت صاحب مدظله العالی

سخن درباب رباعیات می رود، یا رب بیان من مخالف مزاج پیرو مرشد نبود، سه رباعی که در آغاز رقم یافته مضمون آن دارد که علی خلیفه، بود۔ و این عقیده را من نه دارم۔ من علی را امام دانم و دیگران را خلیفه۔ خلافت مرادف سلطنت و ریاست است۔ بزبان عرب رئیس و حاکم را خلیفه گویند، اگرچه معانی لغوی نیابت است، بالجمله علی بلا فصل بعد از نبی امام است و امامت امریست بزدانی و علی امام است هم در عهدِ خلافتِ ابوبکر و هم در عهد خلافت عمر و هم در عهد خلافت عثمان۔ و این که مشهور است که علی بعد از عثمان خلیفه شد غلط است۔ اصل این ست که امام برحق مرتضیٰ چون بعد از رسول امام شد، ابابکر صدیق را خلیفه کرد و امرِ قضا به وے سپرد، تاقطع خصومات مسلمین نماید و بر مومنین فرمانروا باشد۔ پس او و عمر را برگزید و ازاں بعد عثمان را خلافت داد۔ این هر سه تن به داور سپردند و نبی و امام را اطاعت کردند و بعد از عثمان هیچ کس لائقِ عهدۂ قضا در مسلمین یافته نه شد و آن که آرزو کرد نیز شایسته این کار نه بود۔ لا جرمِ امام وقت کارِ قضاء عهدۂ خود گرفت، توجه به قطع خصومات اهل اسلام پرداخت۔ شاه اگر کارِ قاضی کند او را قاضی نه گویند۔ الجمله علی امام ست در عهد ثلاثه، خلافت بعد از عثمانؓ به بنی اُمیه منتقل شد و از ان گروه به آلِ عباس رسید و این هر دو گروه برعکس خلفائ ثلاثه ستم ها کردند و خونها ریختند و امامت علی و اولادش را محو کردند وائمه را کُشتند۔

(اسد اللہ)

غمگینؒ کے فارسی خطوط
غالب کے نام

خط ۔ ا

مشفقا! آنچه اعتراض برلفظ غیر که باطل است حق فرموده اند، بسیار شادماں شدم، اللہ تعالیٰ باین جودت طبع و سخن رندانه ملاقات جسمانی حاصل کناد، جوابش بشنوید: غیر لفظے ست بے معنی، چه معنیٰ، او "عین" است نه غیر۔ پس در این صورت معنی ندارد، اگر عین گوئی یا غیر،ہر دو لفظ حق و این ہر دو صفت یک ذاتند۔ ہماں طور لفظ غیر به مرتبۂ تقید و لفظ عین به مرتبۂ اطلاق خیال فرمایند واگرانا وانت و ہوھذا که از دوئی برمی خیزد از عبارت دور کنند معنی حاصل بشود. برائے فہایش ہرچه گوئی جائز است و از گفتن لفظ غیر غیر نه می شود و از گفتن عین عین نه می گردد۔ آنچه ہست ہست بے نام بے نشاں، ہر جانامے و نشانے دیگر دارد، چنانچه ابن عربی قدس سرہٗ آں جاکه [ذکر] تسبیح خودمی کند می فرماید: "سبحان من اکشف نفسه فسماہ عبدا"، ترجمه: پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے آپ کو مکشوف کیا اور اس کا نام عبد رکھا.

لیکن جائے تعجب است که برائے همین اعتراض نقل سہیل بن عبداللہ تستری و حضرت خواجه جنید بغدادی رضی اللہ عنہما در خط شما نوشته بودم که بزرگان چنین کرده اند چوں که شما بر قول بزرگان اعتماد نه کر دید لہذا حدیث می نویسم که به اصحا ب صفه رسول اللہ صلی اللہ علیه وآله وسلمؐ گفتگوئے همین طور می فرمودند که حضرت عمرؓ در رسیده، رسول اللہ خاموش ماندند ۔ چوں که حضرت عمرؓ به کار دگر پر داختند، رسول علیه السلام به یاران فرمودند که شما خطرۂ دیگر

در دل نیارید که مار از عمرؔ چیزے دریغ باشد. لیکن این وقت گفتن به او مناسب نه بود ازین جهت سکوت کردم۔ وشبلی قدس سرهٔ را چون غلبات وجذبات در رسید به منبر شده برملا این سخنان به خلق گفتن آغاز نهاد ۔ حضرت خواجه جنید قدس سرهٔ گفتند: آنچه من ترا در سردا بها تعلیم نموده بودم تو برملا به خلق اظهار می کنی. شبلی جواب داد من می گویم ومن شنوم اگر حال چنان است از طرف مانیز اختیار دارید و الاّ فلاً (اور اگر نہیں تو پھر نہیں)

ع هر سخن وقتے و هر نکته مکانے دارد

مشفقا! این قوم برائے خدا با خدا همیشه در جنگ اند و هر دم زنارؔی می بندند و می شکنند تا بپایه عالیٔ کفر واسلام میرسند. خیال فرمانید که اکثر اسرار را پوشیده داشته اند و اگر رباعیات این فقیر بدست کسے تقلیدی اُفتد دوکانے برپا سازد و خود را قرار دهد و خلق را گمراه کند و فهم بعضے سخنان تقلیدشان نیز می توانند کرد، زمانے خواهد آمد که راز این رباعیات هم افشا خواهد شد حالا همین طور بدارید۔

من ناچارم که بزرگان دین بمیں کرده اند و مارا از ابتدایٔ سلوک تا انتهانی جذب [اقوال؟] قادریه و نقشبندیه تحریر نمودن منظور [نه] بود و این اسرار ها کم کسے نوشته است و آنکه نوشته اند که من خود فرمان پذیر فتم لیکن فرمان خرد اندرین باب آنست که هر نگرنده بدیدنؔ به کُنه معنی نمی تواند رسید و هر که معنی رانیک تواند فهمید هر آئینه غیر نیست. در سیر الاقطاب همین طور در ملاقات حضرت معین الدین چشتی قدس سره باحضرت محبوب سبحانی رضی الله عنه نقل کرده است که خواجه بزرگ بوقت ملاقات با حضرت

محبوب سبحانی عرض نمودند که سخن خدا بفرمائید. آنجناب فرمودند که سخن را گوشهٔ باید. خواجه فرمودند که احتیاج گوشه نیست چرا که اگر قابل سخن خدا است ازو دریغ نباید کرد و اگر سخن قابل خدا نیست او خود بآن سخن نخواهد رسید لیکن این حکایت سوائ ''سیر الاقطاب'' در هیچ کتاب معتبر دیده نشده و صاحب سیرالاقطاب در مؤرخان چندان اعتبار ندارد۔ و هر که قدم درین راه نهاده است ضعف این نقل برو پوشیده نیست و سند هم ندارد و بطور منقول نوشته است. و نوشته بودند که غیر کو؟ بشنوید که درین عالم شما خود غیر شمائید چه جائے که غیر، این سخن باریک است، هر که به ان مرتبه نه رسید منکشف نگردد۔ ازوقت رسول صلی الله علیه و آله وسلم تا این زمان همه صوفیان این امورات از خلق پنهان داشته اند شما هم همین بکنید. والحال این عین راهم غیر تصور فرمائید۔ و برادرم خیال نمائید که یک وجود نامتناهی است که درآن صفات نامتناهی چند در چند افتاده اند و از حال یکے دیگرے خبرے ندارد۔ شمارا هم مناسب است که بگفتهٔ این فقیر عمل فرمائید و تاکه ملاقات نخواهد شد آنچه که عین وغیر در خیال شما است از این مخلصی مشکل. العاقل تکفیه الاشاره۔

نوشته اند که در دیباچهٔ رباعیات تعریف ما نه نویسید و این کمترین راهمین طور بدارید که درین هم نقصانے نیست۔ بشنوید: دوست می خواهد که کسے منکر دوست ما نباشد پس تعریف اُوبه هزار انواع می کند. پس من چرا تعریف شما نکنم لیکن خاطر جمع دارید که هرگز دروغ نخواهم گفت و تقصیر معاف، از الله تعالی اُمید قوی دارم که این اعتراض

شما بعد ملاقات از شما صادق کناد. آمین رب العالمین. عارف می داند و می بیند که پنبه در جمیع اثواب احاطه ذاتی دارد لیکن ردا و عمامه را پنبه نگویند بگویند، هم چنان عین و غیر را قیاس فرمایند۔

رباعی

اس ایک وجود میں کیسا ہے سیر
زاہد ہے حرم ہے اور غمگین ہے دیر

اسما و صفات ہیں یہ فہائش کے
کہنے سے عین ہو نہ کہنے سے غیر

دیگر

گو چرخ چہار کی تجھ کو ہو سیر
اُس کا تو غیر اور ترا ہے وہ غیر
یہ شرّ خودی نہ جائے جب تک تجھ سے
حاصل عینیت غمگین ہے خیر

شخصے پیش شبلیؒ آمد و گفت: عارف کرا گویند؟ فرمود: ہر کہ ہفت اسمان را بایک تار مو نگاہ دارد، وے خاموش ماند. بعد یک لحظہ شخصے دیگر آمد و گفت عارف کرا گویند؟ شبلی قدس سرہٗ جواب داد کہ تاب باریک پشہ ندارد. شخصے دیگر کہ نشستہ بود شنیدہ حیران ماند و گفت: شیخا اول چناں گفتی و حالا چنیں می گوئی. فرمود کہ ان وقت من نہ بودم او بود، این وقت منم. و فرق میان عالم و عارف ہمین است. [عارف] از حال خود خبر می دہد وعالم از حال دیگرے.

رباعی

عارف کو یہی دوام رہتی ہے سیر
اك دم میں تو شر ہے اور ایک دم میں خیر
ہیں مختلف آن آن غمگین حالات
گاہے ہے عیش اور گاہے ہے خیر

و فہمید سخن غیر ازاں ہم می باشد و مراد ما از اغیار تقلیدیان اند و تقلیدی آن را گویند که برائے عزت و نام و نشان خود این علوم حاصل نماید و براں عمل نہ کنند، یعنی عالم بے عمل و بے حال ۔ و اگر فی الحقیقت پرسید و تکبّر نہ پندارید وافاندہ خود دانید غیر ما ازین عین شما خوشتر است۔

رباعی

وہ شخص لطیف اور وہ فہم ہے پاك
شائستہ ہو اسپ عقل جس کا چالاك
غمگین جو رخش بے محابا ہو تیز
انسان کو شرط اس سے ہے خوف و باك

زیادہ و السلام

خط ـ ۲

مشفقا! مکتوب سامی رسید، خواندم، شادماں شدم و پر بشا نیم بجمعیت خاطر مبدل گردید۔ این مذہب ابتدائے خاص است نہ عام۔ چرا کہ عام در شک وظن اند در یقین نباشند۔ علم الیقین کامل ایشاں را حاصل نیست، اللہ تعالیٰ شمارا بھمین عقیدہ تالقائے خود دارد و ازین عقیدہ آن مشفق چنداں خوشنود شدہ ام کہ بیان آن در اُوراق نمی گنجد۔ سبحان اللہ این مذہب پاکان و خاصان [است] اللہ تعالیٰ جمیع مسلماناں را باین مذہب ہدایت کناد وآنچہ در عقیدہ و معلومات خود و قولِ بزرگان نوشتہ اند ہمہ راست و بجا است و فقیر را باشما محبت و نسبت کہ خود بخود دلم بطرف شما می کشد۔ پس بچہ تقریب بآں مشفق عتاب کند، نہ ان مشفق رابا ما غرضِ دینی نہ دنیوی، صرف از عنایت خود للّٰہ محبت دارند۔ پس این چنین شخصے را کہ للّٰہ محبت دارد بچہ طور کسے عتاب کند۔ چونکہ از غلبۂ محبت رنج بر دلم رسیدہ بے اختیار شدہ صاف بخدمت عالی نوشتہ شد کہ تااطمینان حاصل شود۔ اُنچہ کہ ما بعشق و محبت نوشتم آن مشفق آن را عتاب دانستند۔ من چہ کسم و چہ حقیقت دارم و بچہ سبب عتاب کنم۔ بعید از محبت آن مشفق کہ آں را عتاب دانستند۔ من چہ کس کہ عتاب نماید بلکہ برائے اطمینانِ دلی از محبت خود نوشتہ بودم۔ معاف فرمائید و پیش از رسیدن خط من می دانستم کہ شما را از کسے بزرگ بیرنگی رسیدہ است و آنچہ معلومات خود نوشتہ اند ازین صد چنداں آن مشفق را من زیادہ می دانم۔ احتیاج نوشتن نبود، شخصے با ما گفتہ بود کہ عقیدۂ شما چنان است ازین سبب پریشان خاطر شدہ والان ہیچ نیست۔ خاطر مبارک جمع دارید، وسوال و جواب خود ازسید امانت علی نوشتہ اند۔ مثل مشہور است کہ:۔ ''نیم حکیم خطرۂ جان نیم ملا خطرۂ ایمان'' لیکن البتہ سخن آن مشفق بر سخن سید

غلبه دارد و چرا که این حال بعد حصول خود بخود میشود و الا نه؟ عام و خاص
برابر میشود۔ آن مشفق بجا گفتند، و نزد این طائفه هر که را بیرنگی معلوم نشد
آن را علم الیقین حاصل است بشرط آن که طبیعت او بطرف کسی دیگر نه رود،
چرا که در بیرنگی هر قدر که هدایت است همان قدر ضلالت هم موجود است۔
و شرح این طولی دارد۔ آن مشفق خود می دانند و همین وجه بعضی صوفیه معر
فت الهی را معقول محض گفته اند۔ اگر کسی را این طور تعلیم کرده آید همان
وقت علم النفس حاصل می شود لیکن در این طور کشودی نیست۔ بعد مدت
مدید و عرصهٔ بعید اگر قسمت یاری دهد حرف معلوم شاید که حاصل آید، و
در ابتدای زمان من هم مشاهده و مراقبه بیرنگی بسیار کرده ام، درین طور سالک
از بیعت باز می ماند، و این طریقه بعد حصول نسبت جذبی فائده تمام دارد که در
تحریر نه می آید و این طریقه اگر پیش از جذب می رسد ابتدای خامان است و
بعد حصول نسبت جذبی انتهائی اختصار است، و این طور که عقلی است این
حال بدون صحبت صاحب جذب حاصل نباید۔ منشاء قصور معاف، اگر از ما
پرسیده لائق همت عالی شما نیست که برین اکتفا کرده آید۔ چرا که اگر طفل
ده ساله را این طور بیرنگی تعلیم کرده آید می شود و آن طفل در علم النفس هم
سه برابر اند، و اگر این مقام آن مشفق را خوش آمده باشد این قدر هم کفایت می
کنند، و صاحب این مقام را خبر حال لازمی نه می باشد که دیگری از حال این
خبردار گردد، و آنچه که در تقریر و بیان معرفت حال گفته اند این معرفت
رامعرفت علمی و معقول محض و کلمته الحق می نامند۔

بیزارم از آن گونه خدائی که توداری
هر لحظه مرا تازه خدای دگرست

و آن کیفیات و حالات دیگر که از آن به عین الیقین و حق الحق می
رسیده الله تعالی نصیب کناد۔ این مشاهده بیرنگی را، در زبان هندی بعضی

صوفی هند آنرا گیان نامیده، چرا که انسان را ازین مشاهده ترقی نمی باشد و هیچ یافت نمی شود۔ من که آرزوئ ملاقات شما می دارم نہ برائے این چنین حیرنگی و مشاہدہ بیرنگی کہ چشم در ہوا دوزند با تکیے در حاضر آرند چنانچہ حافظ شیرازی می فرمایند ۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چین
آنجا سرو کہ باد بدست است دام را

و در خبر است۔ تفکروا فی صفات اللہ ولا تتفکروا فی ذات اللہ۔ برائے همین که این جا یافت نیست، و ہیچ کس تا الان بکنه ذاتش نرسیده است و اگر مردمان بر این اکتفا کرده و از کیفیات گونه گون باطنی باز مانده اند آن حال دیگر است و آن ورای طور عقل است و آن حال ذوقی و حدسی است و آن حال چنان است که چشم عقل از نظارهٔ آن خیره می گردد

رباعی

غمگیں ہوتا اگر تجھے علم یقیں
ے عین یقین نہ ہوتی دل کو تسکیں
پھر حق یقین کے ذوق اور شوق میں یار
ہوتا بس حق حق تیرا ملت و دیں

و هر که از کیفیت وجدانی واقف نیست سخن این فقیر عقل او قبول نخواهد کرد، مثلاً اگر کسے نمك نه چشیده باشد اگر هزار طور لذت آن را پیش او بیان کنند لذتش او را حاصل نشود تا که نه چشد، و از عرصه بست سال در آفت حدت گرفتار آمده ام۔ ازین سبب گاه گاه مثل مجذوبان سخن ها می رانم اگر چیزے نوشته باشم و یا بنویسم از عنایات دوستانه معاف فرمایند و معذور دارند که بر دیوانه بے سر و پا احکامِ شرع شریف جاری نیست۔

رباعی

اِک عمر رہی ہے میری اللّٰہ کی جنگ
دیتا میں رہا شکست سو سو فرسنگ
غمگیں مغلوب اب ہوا ہوں ایسا
نہ فوج رہی نہ میں نہ وہ نام و ننگ

والحال کشف فقیر در معرفت جز عجز و بے معرفتی نیست چنانچہ

رباعی

عقلی کہے جو اُسے نہیں وہ عاقل
وجدانی جو سمجھے وہ نہیں ہے واصل
کہتے نہ رسول ماعَرَفنا غمگیں
جز عجز نہ ہوتی معرفت گر حاصل

دیگر رباعی

تو قول علی میں اور مت لا شبہات
غمگیں ہے یہی عَرَفتُ رَبّی کی بات
ہے فسخ عزائم اس لیے فرمایا
آتی ہی نہیں ہے علم میں کنہِ ذات

و فرق درمیان وجدانی و عقلی واضح ترین است کہ صاحب معرفت عقلی تا کہ جمیع تعینات از دل محو کردہ بطرف بیرنگی خود را ندهد خبرت مذموم ہم حاصل نیاید و بران ہم اختیاری ندارد و صاحب وجدانی مشغول ہر کار کہ باشد آں حال خود بخود دروے پیدا می آید احتیاج قصد کردن ندارد و از حال خود وے بے اختیار است۔ چونکہ آں مشفق از حالات خود بعنایت دوستانہ و محبت و یگانگی مفصل آگاہی بخشیدند فقیر را ہم ضرورت افتاد کہ مجملاً

از حالات خود گذشته قدرے در قلم آرد، و چونکه وقت شیخ ما رحمه الله علیه
قریب رسید یک روز در تنهائی می فرمودند که چندے از عمر ما در عالم خواهد
ماند و بسیار کسان را از تو فائده خواهد رسید. ترا باید که بعد وفات ما فلان
شهر پیش فلان بزرگوار بروی و چندے در صحبت شریف وے بنشینی تا ترا
نسبت دوئی و جدائی حاصل آید و بعد حصول نسبت جدائی آنچه که از ما ترا
رسیده است قدر آن خواهی دانست و این طریقه ما ترا آن وقت بسیار مفید
خواهد افتاد. پس بعد وفات شیخ خواستم که بوصیت عمل نمایم، مگر
رخصت نمی داد و می گفت که هیچ طریقه بهتر از مشاهده و مراقبه مرگی
نیست. سرگردان مشو و خود را خوار مساز، هر قدر که از تو آید در همین طریق
کوشش کن و بیست روز و شب مصروف همین طریقه دار. چنانچه این فقیر گفته
عمل بجا آورد و قریب دوازده سال مراقبه و مشاهده مرگی کرد و اکثر بعد نماز
تهجد چشم وا کرده به مشاهده در می آمدم و تا بعد صبح مژگان برهم نمی زدم.
یک پاس بلکه زیاده از یک پاس بدین طور مشاهده می کردم و در خلا و ملا بسته
چشم خود را سر بهوا دوریده می داشتم و هر وقت که فرصت یاری می داد یک
پاس و یک نیم پاس مراقبه می کردم، آخرش مشاهده بجائے رسید که از انوارات
مصفا شده چیزے مثل آئینه محسوس شدن گرفت و مراقبه هم بآن مرتبه رسید.
هر قدر که مشغول نگاه می بود این دم جز عرصهٔ لطیف هیچ چیز محسوس نمی شد و
گاه گاهے که صور مثالی می آمدند آن را دفع می کردم و گاه گاهے حیرت مدهوشی
هم حاصل می آمد و سوائے این مشغل اذکار هم می کردم و مرتبه مشغل
اذکار هم بدانجا رسیده بود که گاه گاه آواز انسانی هم می آمد و آنچه که می
شنیدم در آن عالم راست می شد، ولیکن آنچه که مطلوب ما بود و آن راهی
جسیم نمی یافتم. آخر الامر ناچار شده موافق وصیت شیخ خود قصد سفر کردم
و دران ایام پائے راست و دست چپ از کار رفته بود و شدت درد و وجع ملاحظه

از حد گذشته بود، از نفس خود گفتم با من سرم [با] گوہرے بدست می آرم۔ پس تهیهٔ سفر کرده روانه شدم۔ دو سه مردمان مرا در پیش می نشانیدند و همین طور بیرون می آوردند۔ بارے از عنایت الٰہی زنده در آن شهر که راه یک ماه بود بخدمت آن بزرگوار رسیدم و او شان مرا قبول فرمودند۔ چونکه دوازده سال چیزے کرده بودم و قصد نمودم کیفیات صحبت آن بزرگوار به زودی ظاهر نمود۔ و روز ششم بود که نسبتم متعدی گشت و خواستم که باز گردم، آن بزرگوار فرمود که این را انتہائے نسبت چندے در صحبت ما باش که این ملک تو نمود۔ پس قریب چهار ماه در صحبت آن بزرگوار مقیم بودم۔ بعد از آن بخانه خود آمدم یک سال خود را این نسبت در دادم و باز بخدمت آن بزرگوار رفتم، قریب یک نیم ماه در صحبت نشستم، و آنچه خواست خوشنود بود نمودم۔ حالا بیست سال (است) که از فیض نسبت حضرت بے قید و بے صحبت اکثر در عالم بیرنگی محو و فانی شوم۔ و دیگر حالات خویش مناسب نمی دانم شاید که کسے گمان دیگر برد۔ ازین جهت به این قدر اکتفا کردم۔ بیرنگی و حدت حد است۔ حال بیرنگی را حدت گویند۔ لیکن از صرف بیرنگی حدت حاصل نمی آید بے صحبت صاحب حدت، و چونکه این دو جمع شوند حال به پیش آید که در تحریر نمی آیند۔ و این حال با فقیر حال شخصے می نویسد که او و معرفت تمام دارد که در ماہے دو سه بار او را فنای کلی رو می دهد، و در آن حالت گاہے یک روز و گاہے چهار پاس و گاہے دو پاس و گاہے قریب یک پاس او را بالکل خبر خودی نمی ماند و خصوص موجود او کسے حتیٰ او قرار می گردد، کار و بار دینی و دنیوی او می کند آن وقت آنچه معاملات دنیا موافق عقل است از و بظهور می آیند، هرگز کسے نمی داند که این شخص فانی است و وجود او در میان نیست بلکه بسیار عاقل می دانند۔ مثلاً اگر کسے ازو بپرسد که فلاں مقدمه را تو دیروز آن چنان گفته بودی و من چنین سر انجام نموده ام عقل خود درست کرده

موافق سوال او جواب می دهد و آنچه که گذشته است خود می داند۔ و وقتیکه در خودی خود می آید از سوزش و بیقراری و دیگر واردات و تجلیات خالی نمی باشد و آن حال در اختیار او نیست۔ و گاه گاه او را حیرت محمود ہم می دہد و بطور فنائے استغراق یك پاس قدرتی دارد۔ حیرت محمود آن باشد که در قلب ذوقے و لذتے پیدا شود و دران ذوق و لذت فانی گردد و در تمام عالم بالا تر ازان لذّت ہیچ لذتے نیست، و با مشاہده انوارات و تجلیات ذاتی این کس را فانی کند و بعد ازیں که در خود آید کیفیتے و لذّتے و شورشے این کس را در عالم خودی ہم حاصل باشد۔ و حیرت مذموم آن را گویند کۂ مثلِ پینك افیون بے ذوق و وجدان فنا شود و بعد فنا چون در خود آید ہیچ یافت در دل نیاید و سوائے این فنائے نسبت جذبی در مشاہده و مراقبه بیرنگی ہیچ نیست، انچه که حال آنکس بود نوشتم۔ واللّٰه اعلم بالصوّاب۔

رباعی

ہو جس میں که یافت ہے وہ حیرت محمود
مذموم ہے ہو شہود جس میں نه کشود
ہر چند که اُس کی دید غمگیں ہے محال
ممکن نہیں پر سوا ہو اس کے مشہود

مشفقق من، مضمون تازہ گفته شد برائے داد بخدمت سامی فرستاده می آید۔

رباعی

کر ظن نه کچھ اس شراب ربّانی پر
مت کبر کر اپنے زهدِ نفسانی پر
گر کفر روئی نہیں تجھے اے زاہد
قشقه یه کبود کیوں ہے پیشانی پر

خط ۔ ۳

مشفق! نامہ سامی در عین انتظار چہرۂ وصول افروختۂ باعث افتراح کثیر خاطر محزون گردید، مافیہا بہ دریافت رسید۔ آنکہ در رقیمہ سابق بعد بیان اعیان ثابتہ این فقرہ واقع بود کہ از طرف تصوف ہم اطمینان کل حاصل شد۔ آن مشفق را در علم تصوف دستگاہ است و این دستگاہ از بعضے مراسلات [مسرت] آیات معلوم شدہ، چنین دستگاہ علم تصوف علماء ظاہریہ را نیست و علم الہی در احاطۂ ہیچ کس نمی آید چرا کہ نامتناہی است، و آن کہ توجیہ در ثبت اعیان قول ہستی موہومہ است۔ مشفقا! اعیان عین ذات اند و انفکاک آنہا از جہت غیبیت از ذات محال، پس آن اعیان را کہ ثابت در علم حق و من حیث ہی عین ذات اند بسوی وجود وہمی کہ اعتبار صرف است چہ نسبت و تعلق، و فائدہ از نفی بوئ وجود وہمی کہ وجودے ندارد چہ، و جناب امام حسینؓ فقط اعیان فرمودہ اند و اگر ازیں اعیان ممکنات مراد گیریم قباحتے ندارد چرا کہ ممکنات بوی وجود نہ سمیدہ اند و این وجود کہ ہست وجودے ندارد۔ و آن مشفق کہ خیال ثابتہ با خطوط شعاعی آفتاب و امواج محیط ازعم فرمودہ اند ہم مناسب نمی نماید، چرا کہ خطوط شعاعی و امواج فرمایند رواست و مقام اعیان ثابتہ جائے تغیر و تبدیل نیست کہ گاہے چنین باشد و گاہے چنان، بر خلاف امواج و خطوط شعاعی کہ در مقام تغیر اند و اعیان ممکنات را تغیر است بر خلاف اعیان ثابتہ کہ عینِ ذات اند۔ چنانکہ ذات از تغیر مبّراست و اعیانِ ثابتہ ہم از تغیر معراء۔ و مشفق من! خطوط شعاعی بسبب نقصان بصارت ہر یکے می شوند و آنان کہ مشاہدہ آفتاب می کُنند و نظر را در آن تیز نمایند او شان را خطوط شعاعی اصلا بنظر نمی آیند۔ چنانچہ ما ہم در ابتدا دو سال این کار کردہ، و آن کہ مرقوم فرمودہ اند ہمان عینِ ثابت زید است کہ در وجود مطلق موجود است۔ مشفقا!

وجودِ مطلق عبارت از لا تعیّن است که دران ہمہ نسبت و اعتبارات و تعیّنات مستہلك اند۔ ہیچ صفت را دران مرتبہ ظہور نیست با انکہ جمیعِ اسما و صفات و تعینات و اعتبارات عین لا تعین اند البتہ اعیانِ ثابتہ در مرتبہ وحدت کہ تعین اول است محقق و ثابت اند، و آنانکہ از علمِ تصوف خبر دار ند وجود مطلق را اصلاً محلّ اعیان ثابتہ نہ گویند و یقین دانند کہ اعیانِ ثابتہ و تعینات عین وجود مطلق اند، و درسہ چہار رسالہ ہای تصوف این عبارت کہ ماشامّتِ الاعیان رائحۃ الوجود دیدہ شد لیکن کسے ایں قول را از جنب حسین علیہ السلام روایت نکردہ۔ و مولانا عبدالرحمان جامی ہم در رسالہ "مراتب ستۃ" ابن قول آوردہ لیکن آن را مستند بہ تجلیاتِ امام علیہ السلام نہ کردہ و در رسالہ "معرفۃ الفقر" کہ نزدِ این فقیر معتبر تر است قول مذکور دربابِ ممکنات واقع است بے اسناد بجناب امام علیہ السلام، و عبارت آن مقام نوشتہ می شود تا آن مشفق ہم ملاحظہ فرمایند و آن عبارت اینست "وجود مطلق عبارت از وجودِ واجب است چرا کہ وجود در واجب باید والا انحصار موجود در ممکن لازم آید و بر این تقدیر یافتہ نشود، ہیچ ممکن مستقل نیست بہ وجود خود فی نفسہ بلکہ در وجود خود محتاج بوجود واجب است و ہو ظاہر، او نہ قادر است بر ایجادِ غیر، چہ مرتبۂ ایجاد بعدِ مرتبۂ وجود است۔ ہر گاہ کہ ممکن دراصل وجود نہ داشتہ باشد ایجاد از و ممتنع بود، پس ممکنِ وجود نیست نہ بذاتہ نہ لغیرہ، لانّ الاعیان ماشامت رائحۃَ الوجودِ فاذنْ ثَبَتَوجودُ الواجبِ لانہٗ اصلُ الاذواتِ و مبدأء الموجودات۔ وَ بخدمت آن مشفق برائے تحقیق می نویسم کہ من درسہ چہار کتب معتبرہ قولِ ھذاء ماشامّتِ الاغیان رائحۃَ الوجود دیدم لیکن سند این قول بجناب امامِ علیہ السلام کسے نہ نوشتہ بلکہ در رسالہ تصنیف امام علیہ السلام کہ مسمی "بمرآت العارفین" پئے ملتمس زین العابدین است دیدہ ام ذکر اعیان ثابتہ ضمناً واقع نیست۔ لہذا بہ آن مشفق تصدیعہ می دہم کہ اگر آن قول مستند است و

حواله اش از کسی کتاب معتبره رسیده باشد اطلاع فرمایند که ما را نیز تمسک باشد۔ و مشفق من انچه که مرا تحقیق بود نوشته شد دیگر آن مشفق اختیار دارند، و چون در خط سابق نوشته بودم که آینده نامه های شوقیه ارسال خواهند یافت و سخن در مقدمات متوقف بر وقت ملاقات موقوف۔ ازین جهت اکتفا بر همین قدر تحریر نموده شد، و در خط سابق که نوشته بودم که آن صاحب را ان بانه غرض دینی نه دنیوی بلکه لله محبت دارند، مراد من از غرض دینی و دنیوی آنست که هیچ غرض نه دارند و هر که صاحب بیرنگی است بے غرض است الآاز لوازم بیرنگی که محبت ذاتی است می باشد و کسی را بیرنگی فروسی گرد آزاد از رندگی و از گفتن نیک و بد خلق پروائے نه دارد چرا که خلق را نزد او وجودے نیست پس اگر دوست نیک گوید یا بد، همهٔ پسندیده است، و سوائے ازین بعضی آزادان در ابتدا برائے غلبهٔ محبت و سکر و فنائے کشی کرده اند و بعد رسیدن مقصود ترک آورده اند۔ و مشفق من ما را این طور ازادانه بسیار پسند است و مردمان که بطور خود حال شما بیان می کنند آن همه ازان صور آزادانه شما انتزاع می کنند و ما را آن طور خوش است و برائے همین ملاقات می خواهیم که اگر این چنین شده برے به دام ما افتد جز شکار عنقا نه پردارد، و در شده جهان آمد غرار غمردمان اند که ما را با اوشان چه کار و اوشان را با ما چه کار۔ چرا که اوشان ریش دراز و لب کوتاه و دانهٔ تسبیح بزرگ و جبّهٔ فراخ می خواهند و این حالین چنین چیزها یافت نیست و من از طریقهٔ شما بسیار راضی ام، الله تعالی شما را در بیرنگی در دهد و اگر از ما ملاقات خواهد شد ما هم در باب بیرنگی تائید خواهیم کرد و این طریقه پسندیده ماست، از درون آشنا و از بیرون بیگانه، جنس هم چنین زیبا روش کم می بود اندر جهان۔

دیوان رباعیات که تیار می شود انشاء الله تعالی بوقت ملاقات به آن مشفق داده خواهد شد۔ بعد ملاحظه اش یقین است که عش عش خواهند فرمود، و

مشفق من! شمارا قدر من بے ملاقات مثل خر دل است چرا کہ فہم شما دیگر است و حالات ما دیگر۔

خدا کند کہ شما از فرنگستان برائید و دعوی با مدعی یکساں شود، و آنچہ کہ در خاطر شماست ظہور نماید، مشفقا مادہ قاریخ دیگر بے تعمیہ بخیال آمدہ۔ اُمید کہ تاریخ سابق و این تاریخ را ملاحظہ فرمودہ۔ آنچہ بہتر باشد بران اطلاع فرمائند تا در دیوان نوشتہ آید۔

قطعۂ تاریخ

بنا کرد چوں جان[1] صاحب مکان

بشد فکر تاریخ بر من اَدق

ندا از سر عقل آمد بہ دل

مکان قلندر بو عرش حق

دیگر

بنا کرد چوں جان صاحب مکان

بشد فکر تاریخ غمگیں ادق

ندا آمد از غیب جاں

مقام قلندر بود عرش حق

۱۔ جان صاحب کا تخلص قلندر تھا، اسی مناسبت سے قلندر قطعہ تاریخ میں بھی لایا گیا ہے۔

خط ۔ ۴

خط از جناب حضرت صاحب بمرزا نوشہ

مشفقا! من در بابِ تفضیل امیر علیہ السلام تحقیق شما خواستہ بودم نہ در امامت و خلافت۔ شما جناب امیر را از خلافت ہم معزول کردید۔ اول عفو تقصیر می خواہم، بعد ازان چند حروف می نویسم، چند حروف، آن مشفق را شاید کہ معنیٔ خلافت و امامت بہ تحقیق نہ رسیدہ کہ امیر علیہ السلام را صرف امام می دانید و خلیفہ نمی پندارید۔ این مذہب تراشیدۂ سامی است، ہر چند خوب می دانم کہ آن مشفق از طریقۂ خود بر نہ خواہند گشت لیکن چونکہ این فقیر دوست شما است واجب شد کہ انچہ حق باشد می نویسم۔ آن مشفق کہ خلافت را حمل بر سلطنت کردہ اند محض بے جا است و حقیقتِ سلطنت و خلافت ازین حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قیاس باید کرد کہ:۔ "الخلافۃ بعدی ثلثون سنۃ [ستزون ملکاًعضوضاً]" پس اگر خلافت مثل سلطنت می بود، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لفظ "ملک عضوض" نمی فرمودند و دیگر آن مشفق خلافت را حمل بر قضا بطور اہانت کردہ اند و حقیقت قضا این ست کہ حدیث نبوی در حق علی مرتضی واقع است کہ "اقضہہم علیؑ" یعنی در جمیع اُمت اقضیٰ علی است۔ پس موافقِ حدیث شریف در ہمان سی سال تاشش سال علی مرتضی خلافت کردند و داخل خلافت شدند۔ صرف امام دانستن بہ چہ وجہ؟ و آں صاحب معنیٔ خلافت تا الآن نہ فہمیدہ اند کہ خلافت چیست؟ نہ قضا است و نہ سلطنت بلکہ قضا و سلطنت نیز داخل

حقیقت خلافت اند، و صاحب فتوحات یکی از انواع چهارگانه ختمے دارد۔ خاتم نوعِ اوّل از ولایت محمدی که جامع به آں صوری و معنوی و مقرونِ خلافت باشد علی ابن ابی طالب علیه السلام را نوشته، زیرا که امر خلفائے راشدین است و مذهب سامی [در] خلافت این حدیث است که:۔ الخلافة بعدی ثلثون سنة و قد تمت بعلی" وایں ختم را خاتم کبر گونید وآں مشفق باوصف "قدتمت به علی به خلاف این حدیث بنی اُمیه و آل عباس راخلیفه پنداشتند و این سراسر خلاف است۔ چراکه این همه داخل "ملك عضوض" هستند داخل خلافت نیستند۔ وچوں که حق تعالی به ملائکه فرمود که "انّی جاعلٌ فی الارض خلیفه" پس ملائکه مثل [مذهب] سامی بنی اُمیه و آل عباس و امثال ایشاں [راخلیفه] تصور نموده گفتند "اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفك الدمآ و نسبح بحمدك ونقدس لك" پس تازیانه "انی اعلم مالا تعلمون" دریافت نمیند و اگر عقل کار نه کند از کسے عارف به پرسند، واین چهار اصحاب در آں خلافت شریك که حق تعالی این فرماید که "انی اعلم ملا تعلمون" و در صورتے که ملائك از ادراك معنی خلافت محروم ماندند گه از آں مشفق عبث است، وس چناں که از دو حدیث نبوی خلافتِ امیر علیه السلام ثابت نموده ام شما از یك حدیث بطلانِ خلافت جناب امیر ثابت کنید۔ و این فقره که نوشته اند که "حضرت امیر از طرفِ خود اصحاب ثلثه راقضا سپردند و وقتے که کسے قابل قضا نه ماند خود قضا اختیار کردند" این سخن در هیچ کتاب دیده نه شده، شاید که در کتب روافض باشد۔ و لطف این است که در خلافتِ عمرؓ فیصلۂ قضا یائے مسلمین جناب امیر علیه السلام می کردند و عمرؓ فرموده بودند که "تا ابن مرد دانا در شما است هیچ مسئله از ما نمی پرسید"۔ مشفق

من! عجب تحقیق سامی است که اعیان ثابته را به امواج محیط و خطوط
شعاعی را به آفتاب تشبیه می دهید و خلافت را به قضا و سلطنت۔ آنچه آن
مشفق فرمایند در هیچ کتب صوفیه و اهل سنت و الجماعت دیده نه شده،
نشان [ ] نه دادید که از کجا می فرمایند؟ و مذهب ما موافق قرآن شریف و
حدیث نبویؐ و اقوال عارفان صوفیه است، خلاف این را مسلّم نمی داریم
بلکه باطل می دانیم۔ و این چه طریقه است [----] که کسے امیر المومنین
علی علیه السلام را خلیفه نه داند؟ و چون سبق را ارقام نموده ام که گفتگوے
به ملاقات موقوف است۔ لهذا بر همین قدر اکتفا نموده شد که آں مشفق
برین حدیث مرقومه نگاه فرموده تامل فرمایند و دیگر من در جواب حضرت
سامی جز خاموشی چاره نه دارم۔ ازین جهت سکوت ورزیدم۔ و آن مشفق
نوشته "امامت امرے ست بردانی"۔ انصاف فرمائید که کدام امرے است
که بردانی نیست؟ و این چه تعریف امامت است که شما کرده اند؟ و
حقیقت امامت و خلافت جز عارفان کامل کم کسے می داند اگر پرسیده
آید مشکل افتد۔ الله تعالی آن روز به ظهور آرد که ملاقات، ما و شما شود و
گفتگوئے این جمیع امور بالمشافه کرده آید۔ المکتوب نصف الملاقات۔ این
خط روبروی علماء و فقراء آن جا گذارید۔ ملاحظه فرمائید که کدام طریق
محمود است و کدام مذموم؟ و ما که علی علیه السلام را تفضیل می دهیم
موافق کلام الله و حدیث شریف است نه از مذهب تراشیدهٔ خود۔ مشفق
من! آنچه از سینه زوری جواب خواهند داد مسلّم نه خواهیم داشت۔ اگر از
کلام الله و حدیث شریف و قول علماء و صوفیه [---] و تحریر فقیر پسند
افتد یا نه افتد جواب این سوای از کلام الله و حدیث شریف نمی خواهیم،
وعقل سلیم آن را گویند که مطابق کلام الله و حدیث شریف باشد نه خلاف

آں۔ پس اگر آیت و حدیث در بطلان خلافت جنب امیر علیه السلام بہم نه رسد مناسب است که شوقیه بنویسند و این قصه را موقوف نمایند۔ چرا که از چنین سخنان، تحریر پریشاں هیچ فایده نیست والسلام علی من اتبع الهدیٰ (۱۲۵۶ھ)۔

(نوٹ)۔ اس کے بعد مرزا غالب کا کوئی خط نہیں گیا شاید حد و کتابت ختم ہو گئی۔ (مرتّب)

ضمیمہ ا

توضیحاتِ غمگینؒ خط ا، ۲، ۳، ۴

بابت خط ۔ ا

''تقید'' اور ''اطلاق''، ''عین'' اور ''غیر'' یہ اصطلاحات تصوف کے انتہائی غامض و دقیق اور پہلو در پہلو مسائل و احوال سے متعلق ہیں۔ اس مختصر سے حاشیہ میں ان تصورات کی مکمل تشریح تو ممکن نہیں مگر جس حد تک اس خط کے مضمون کو سمجھنے کے لیے عرض کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مسئلہ وحدت الوجود تصوف کے انتہائی اہم اور نازک موضوعات میں سے ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ نظریہ بھی ہے جس کی مختلف شکلیں دیگر مذاہب اور ملتوں میں بھی موجود رہی ہیں۔ اس کے علاوہ وحدت الوجود ایک روحانی شعور و کیفیت بھی ہے، ایک مخصوص مذہبی تجربہ بھی ہے جس سے متعدد فکری، روحانی اور اخلاقی رویے جنم لیتے ہیں۔ یہ وہ نظریہ ہے جس کی مدد سے بہت سے لوگ راہِ خدا پا گئے جب کہ اسی کی بدولت کچھ لوگ گمراہیوں میں بھی جا پڑے۔ بعض اوقات جو مطلب اس اصطلاح کا ایک عام آدمی سمجھ بیٹھتا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ خدا ہی کے وجود کا امتداد ہے اور خدا بعض مظاہر فطرت میں متمثل ہو کر سامنے آتا ہے اور انسان اور خدا کا تعلق سمندر اور لہروں کا سا ہے، یہ بات تو ظاہر ہے کہ توحید کی اسلامی تعلیم کے منافی ہے اور Pantheism کی راہ ہموار کرتی ہے جو کہ ایک کفرِ صریح ہے۔ لیکن اگر اسلامی عقائد کے محکمات کے دائرے میں رہ کر اس نظریہ کی وضاحت کی جائے تو کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی کائنات میں کارفرما ہے اور یہ عالم شہود اسی کی صفات کا ظہور ہے۔ اللہ کا ارادہ ہر ایک حادثہ اور حادث پر حاوی اور غالب ہے، اس کی مرضی اور علم کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ جس صوفی پر شعور غالب آ کر اس کے خیالات میں راہ پا جائے وہ کائنات کو ایک خاص نظر

سے دیکھنے لگتا ہے، اس کو وجود حقیقی صرف اللہ کا معلوم ہوتا ہے باقی ہر ایک کا وجود اعتباری، اضافی، فانی اور ناقص نظر آتا ہے جیسا کہ وہ حقیقتاً ہے بھی۔ اس تشریح کے بعد تقید و اطلاق، عین اور غیر جیسی اصطلاحات کا مفہوم کسی قدر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جب کسی وجود یا موجود کی نسبت مخلوق کی طرف کی جائے تو اس کو مقید اور غیر کہا جاتا ہے اور جب موجود حقیقی، جو کامل اور مطلق، ازلی و ابدی ہے اس کی جانب اشارہ مقصود ہو تو اطلاق اور عینیت کے الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی عینیت سے مراد اپنی ذات کو خدا کی ہستی میں گم کر دینے کی ہوتی ہے۔ بایں معنی کہ انسان فانی ہو کر اپنے آپ کو اس ذاتِ باقی کے سپرد کر دے اور اپنی ہستی کو کلیتہً مٹا دے۔ سید علی غمگین کہنا یہ چاہتے ہیں کہ وہی سب کچھ ہے کیوں کہ حقیقی وجود اس کا ہے باقی جو کچھ عالم امکان میں دکھائی دیتا ہے وہ محض ایک لمحۂ عارض ہے اور آنی جانی شے ہے۔ مقید اور غیر سب کے سب اعتباری اشیاء اور اضافی امور سے تعلق رکھتے ہیں تو غیر کا ہونا نہ ہونا برابر ہوا۔ اس لیے کہ اس ذات یکتا کے علاوہ جو کوئی بھی موجود ہے وہ قیود زمان و مکان میں مقید اور حدوث و امکان کی حدود میں محبوس ہے۔ بقول غالب ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔ اس سارے نظریہ کے پہلو اور پرت بے شمار ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس تصور میں کچھ اخلاقی سبق بھی پنہاں ہیں مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر توجہ مرکوز رکھو، اپنے آپ کو اس کے سامنے ہیچ گردانو! اپنی خواہشات کو اس کے ارادہ کے سامنے فنا کر دو اور اس حد تک کر و کہ اس کی اطاعت ہی تمہاری خواہش بن جائے کہ یہی تقویٰ کا دوسرا نام ہے، وغیرہ وغیرہ۔ تصوف میں یہ تعلیم اس لیے دی جاتی ہے کہ بہت سے باطنی امراض اور اخلاقی خرابیاں خود پسندی، خود پرستی مرکزیت ذات(Self-referentiality) ہی سے جنم لیتی ہیں اس کے علاوہ اپنی ہستی کو فنا کر کے ہی قربِ الٰہی اور معرفت ربانی کی مستی حاصل ہو سکتی ہے۔

بابت خط۔۲

ا۔ صورِ مثالی:

صوفیاء اس دنیا اور عالم بالا کے درمیان ایک درمیانی وجود عالمِ مثالی کا مانتے ہیں۔ اس درمیانی دنیا میں انسانی اعمال مثالی صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ جو بات یہاں ایک مجرد حقیقت کی صورت رکھتی ہے وہاں ایک مثالی شکل میں موجود رہتی ہے۔ گویا ہمارے ہر عمل کی ایک جھلک یہاں محفوظ رہتی ہے اسی طرح عالم با ا کے متعلق کچھ حقائق بھی عالم مثال میں رموز کی شکل میں موجود رہتے ہیں۔ بعض صوفیاء نے عالم برزخ اور عالم مثال کو ایک ہی حقیقت کے طور پر پہچانا ہے جیسے شاہ ولی اللہ وغیرہ۔ ان حضرات نے بعض احادیث کی روشنی میں عالم مثال کی تشریح کی ہے۔ کچھ لوگ افلاطون کے عالمِ افکار اور عالم مثال کے درمیان مماثلت دیکھتے ہیں۔ اول الذکر اس حد تک تو اس سے مشابہ نظر آتا ہے کہ یہاں کسی واقعہ کے وجود میں آنے سے پہلے اس کی ایک تصویر کشی عالم افکار میں ہوسکتی ہے پھر جو بات یہاں دنیا میں وقوع پذیر ہوتی ہے وہ اسی عالم افکار کی صورت کی ایک تشکیل ہوتی ہے۔ بہر حال صور مثالی سے اشارہ عالم مثال کی جانب ہے جہاں اس دنیا اور اُس دنیا کے حقائق و واقعات کی مثالی صورتیں پائی جاتی ہیں۔

۲۔ سلطان الأذکار:

اللهم أنت ربی لا إله إلا أنت خلقتنی وانا عبدك وعلى عهدك ما استطعت أبوء بنعمتك عليّ وأبوء بذنبی فاغفرلی إنه لا يغفرالذنوب إلاّ أنت۔

۳۔ جذب:

صوفیاء کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کا قرب دو طریقوں سے حاصل ہوسکتا ہے ایک کا نام

جذب ہے، دوسرے کا سلوک۔ اوّل الذکر میں اللہ تعالیٰ خود کسی بندے کو اپنے راستہ کی طرف کھینچ لیتے ہے اور بہت جلد اس کو ایسا قرب نصیب ہو جاتا ہے جو اطاعت، ذکر و شکر، محبت اور معرفت الٰہیہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرا راستہ سلوک کا ہے جس کا مطلب ہے اطاعت کے راستہ پر چلتے رہنا اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتے کرتے بالآخر قرب الٰہی حاصل کرنا اور اس قرب کے ساتھ اس کی محبت، معرفت اور معیت میں راسخ ہو جانا ہے۔ ان دونوں راستوں کی جانب قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

"اللہ یجتبی إلیہ من یشاء ویھدی إلیہ من ینیب" (۴۲: ۱۳)

۴۔ فناء کلّی:

جن کو اللہ تعالیٰ سے محبت اور معرفت کا تعلق حاصل ہو جاتا ہے ان کی روحانی ترقی میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب وہ اپنی رائے، خواہش اور مقاصد کو کلیتاً اللہ تعالیٰ کی مرضی میں گم کر دیتے ہیں اگر چہ ان کا وجود الگ ہوتا ہے مگر شعور مکمل طور پر ارادہ الٰہی کے تابع ہو جاتا ہے جب کسی کا یہ یقین یا ''مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ'' اس کا حال بن جائے تو اسی کو فناء کل کہا جا سکتا ہے۔

۵۔ حیرت: محمود و مذموم:

عقل کی رسائی کائنات کے اعلیٰ حقائق تک نہیں ہو سکتی بلکہ قلب جب معرفت سے منور ہوتا ہے تب اس سطح تک انسانی شعور پہنچ سکتا ہے اس سطح پر پہنچ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس نورِ عرفان کا درجہ اس کی محدود سطح سے بلند ہوتا ہے۔ جب عقل اپنی اس محدود سطح کو تسلیم کر کے اس صورت حال کو تسلیم کر لے اور اپنے آپ کو اعلیٰ روحانی حقائق سے ہم آہنگ کر لے تو پھر یہ حیرتِ محمود ہے اور اگر اپنی برتری پر اصرار کرے تو ظاہر ہے کہ وہ گمراہی میں جا پڑے گی اس صورت میں اس کی حیرت مذموم ہوگی۔

۶۔ تفکروا فی خلق اللہ ولا تفکروا فی ذات اللہ

گو کہ یہ الفاظ بطور حدیث صوفیا کے ہاں مشہور ہیں لیکن حدیث کے مستند مآخذ جیسے صحاح ستہ وغیرہ میں اس کا وجود نہیں ملتا۔ عموماً اس کی وضاحت میں یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ صوفیا کا اصل مقصد ایسے الفاظ سے محض ایک سبق حاصل کرنا ہوتا ہے (نہ کہ کسی حکم شرعی کا ثبوت فراہم کرنا) اس لیے ان اقوال کے مستند ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں نہیں پڑتے۔

بابت خط۔۳

۱۔ اعیان ثابتہ:

اعیان ثابتہ سے مراد اس دنیا میں وہ موجودات ہیں جن کا وجود ثابت اور جن کی شناخت واضح ہے جیسے چاند سورج، ستارے، سیارے، انسان۔ اعیان ثابتہ کو ماننے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ کچھ لوگ دنیا کو ایک واہمہ ہی قرار دینے لگے تھے۔

۲۔ اعیان ممکنات:

اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے اس کو تین اقسام میں منقسم مانا جاتا ہے' اول واجب الوجود، یعنی اللہ تعالیٰ جس کا وجود لازمی ہے پھر ممکن الوجود، جس کا وجود ہو سکتا ہے اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرے اور تیسری قسم ممتنع الوجود، وہ جس کا وجود محال ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا کوئی مزعومہ شریک۔ اعیان ممکنات میں وہ entities شامل ہیں جو ممکن الوجود ہیں یعنی اپنا ذاتی وجود کوئی نہیں رکھتیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عدم سے نکال کر وجود بخش دیا اس لئے موجود ہو گئیں۔

بابت خط۔۴

۱۔ تفضیل علیؓ:

اس سے مراد یہ ہے کہ بجائے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حضرت علیؓ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلا خلیفہ ہونے کا زیادہ مستحق سمجھا جائے۔ جو لوگ ایسا خیال رکھتے ہوں انہیں تفضیلی بھی کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگ ضروری نہیں کہ اثنا عشری مذہب کے عقائد کو تسلیم کریں بلکہ وہ صرف حضرت علیؓ کی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ پر فضیلت کے قائل ہیں۔ یمن کے زیدی حضرات زیادہ تر اس قسم کی تفضیل کے قائل ہیں۔

ضمیمہ۲

اقتباس مضمون بہ عنوان ''غمگین اور غالب'' از پروفیسر محمد مسعود احمد، مطبوعہ میر سید علی غمگین دہلوی المعروف حضرت جی مرتبہ نسیم حضرت جی، علمی کتاب گھر کراچی۔ ص ۲۴۹۔

''حضرت غمگینؒ اور مرزا غالبؔ کی مراسلت ۱۲۵۳ اور ۱۲۵۶ھ کے عرصے میں ہوئی۔ حضرت غمگینؒ کے خلیفہ سید ہدایت النبیؒ نے ۱۲۵۷ ہجری میں حضرت غمگینؒ کی حیات ہی میں ایک مجموعے کی شکل میں ان تمام خطوط کو مرتب کر لیا تھا۔ یہ قلمی مجموعہ کتب خانہ فقیر منزل گوالیار میں موجود ہے۔ ۱۹۶۳ء میں اس مجموعے کی نقل غمگین اکادمی گوالیار کے ڈائرکٹر جناب رضا محمد حضرت جی نے ازرہ کرم راقم کو بھیجی تھی اور اشاعت کی فرمائش کی تھی۔ چونکہ راقم دوسرے علمی کاموں میں مصروف تھا اس لئے بہ خوفِ تعویق ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب کو ان کی فرمائش پر وہ نقل بھیج دی گئی جو انھوں نے اور نٹیل کالج کے شمارے فروری ۱۹۶۴ء میں شائع کر دی۔''

ضمیمہ ۳

پیش لفظ

از شاہ رضا محمدؒ حضرت جی غفرلہ

مرزا غالب مرحوم نے جو رقعات حضرت خدانما میر سید علی شاہ غمگین نا خدائے سخن علیہ الرحمۃ کی خدمت بابرکت میں ارسال کئے، اور جو رقعات جواب میں تحریر کئے گئے ان سب کو حضرت جی شاہ غمگین خدانما کے ایک جلیل القدر خلیفہ مولانا حافظ میاں ہدایت الٰہی قادری گوالیاری مرحوم و مغفور نے جمع کر کے اپنی قلم سے نقل فرمائے ہیں۔ یہ نسخہ کتب خانہ فقیہ منزل گوالیار جلد نمبر 33/1 پر موجود ہے۔

مذکورہ بالا مجموعہ خطوط ۱۲۵۷ہجری میں نقل کیا گیا ہے جب کہ حضرت غمگین خود حیات تھے۔ اس قلمی مجموعہ میں کل سولہ خطوط ہیں اور ایک مختصر مضمون ہے جو مرزا غالب مرحوم نے دہلی کی ایک طوفانی آندھی کا حال بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس مجموعہ میں دس خط وہ ہیں جو مرزا غالب نے شاہ غمگین علیہ الرحمۃ کو بحیثیت اپنے پیر و مرشد رقم کئے ہیں، اور دو خط وہ ہیں جو مرزا غالب نے اپنے لکھنو کے دوستوں کے نام لکھے ہیں لیکن شاہ غمگین کے صرف چار جوابات ہیں، جو اسرار و معارف کے قادر مرقعے ہیں۔

یہ خط و کتابت ۱۲۵۳ہجری لغایت ۱۲۵۶ہجری تک جاری رہی ہے۔ مرزا غالب کے تین خطوط میں سنہ بھی تحریر ہیں مگر دیگر چار خطوط میں صرف تاریخ لکھی ہے اور تین خطوط میں نہ تاریخ ہے اور نہ سنہ، اور حضرت صاحبؒ کے خطوط میں نہ تو تاریخ ہے اور نہ سنہ۔

[بتاریخ ۱۵، مئی ۱۹۶۱ع]

ضمیمہ۴

دیباچہ

[از ہدایت النبی قادری گوالیاری]

حمد بے حد جناب دبیرے که کتاب ظهور و بطون آدم نقطه ایست از قلم قدرت او، و نعت بے عدد جناب پیغمبرے که دیباچه موجودات از عنوان ذات مقدس او، اما بعد آنکه بنده سراپا گناه ہدایت النبی قادری گوالیاری خواست آنچه که مرزا نوشه متخلص بغالب متوطن اکبرآباد و حال ساکن جهان آباد که در نظم و نثر نظیر خود ندارند چند مراسلات برو بعد اُخری عبارت متین و مضامین نو آئین که هر یک جائے خود گنج است و اکثر مشتمل بر ذوق و شوق و محبت جامع حقیقت و معرفت، عاشق بے باک طریق عشق حقیقی و مجازی، واقف اسرار زهد و اخلاق، جامع علم و اخلاق، سیراب تشنگی تشنه لبان وادی شوق، عطشانای کوثر تشنه دلان صحرای ذوق، جمع رساله خود، وحد فرمودی اسرار ناگفته و ناشنیده، مرشدی و مولائی حضرت میر سید علی عرف حضرت جی صاحب دام اقبالهم و بر کنیه ترسیل داشت و آنجناب جواب با صواب که هر یک بجای خویش کتب خانه و اسرار عجیب و غریب را جواب و بلکه بر حرفش خدا شناسی را چراغے و بر شوق را معنی است ارقام فرموده اند جمع نمایم، به دلم آمد و بخاطرم گذشت که اگر گلهائے که رنگ و بوی مطالب و مقاصد صوری و معنوی دارند گلدسته مجموعه گردد و مشام طالبان حقیقی و مجازی معطر و معنبر گردد، بنا بران هر یک سوال و جواب را به ترتیب ارقام نمود اگر سهوے از سهو بوده باشد معاف فرمایند و جامع را به دعای خیر یاد آرند۔

۱۲۵۷ھ
۱۸۴۳ء

ضمیمہ ۵

شجرہ

(۱) شاہ نظام الدین (عرف کالے صاحب)
- نواب محمد میر خاں

سید محمد شاہ
- (۲) میر سید علی غمگین
  - (۳) سید میرن علی شاہ
    - سید عزیز احمد شاہ
      - سید نظیر محمد شاہ
      - سید علی محمد شاہ
    - (۴) سید فقیر محمد شاہ
      - سید عبدالوہاب
        - رزاق محمد شاہ (۶) (سیّد رضا محمد شاہ)
          - سید شاہد محمد شاہ
          - سید کامل محمد شاہ
          - سید منعم محمد شاہ
          - سید ریاض محمد شاہ
          - (۷) سید اعجاز محمد شاہ
        - سید قدیر محمد شاہ
      - (۵) سید غنی محمد شاہ
        - سید علی عرف خدا محمد شاہ
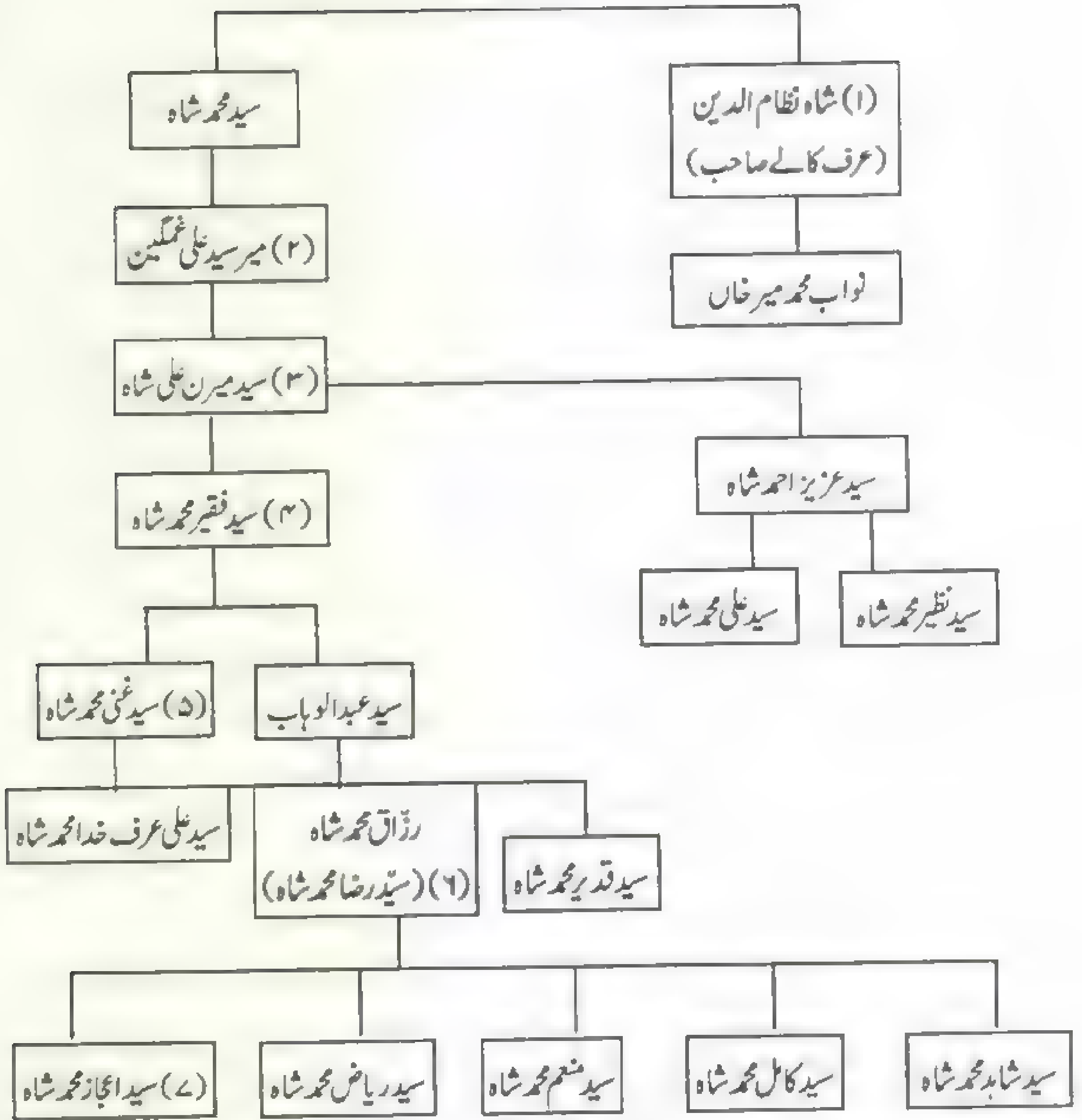
نوٹ: جن ناموں کے ساتھ نمبر دیئے گئے ہیں وہ بالترتیب سندھیا حکومت ریاست گوالیات میں سرداری کے عہدے پر فائز رہے۔ رضا محمد صاحب کی وفات (۲۴ مارچ ۱۹۷۴ء) کے بعد سرداری کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ضمیمہ ۵۔ ملحوظ ہو کہ جناب خواجہ محمد فاروقی نے جن حضرات کی نشان دہی کی ہے وہ مندرجہ بالا شجرہ میں ۵ اور ۶ پر موجود ہیں اور یہ شجرہ ڈاکٹر سید جمیل اختر۔ اسسٹنٹ پروفیسر آف اردو۔ کملا راجہ کالج گوالیار۔ ہندوستان کی مرتبہ کتاب بعنوان ''میر سید علی غمگین دہلوی حیات، شخصیت اور شاعری'' کے ص ۱۷ سے لیا گیا ہے۔

مترجم و مرتب

ضمیمہ ٦[1]

در وصل دل آزاریِ اغیار نہ دانم
دانند کہ من دیدہ ز دیدار نہ دانم
طعنم نہ سزد مرگِ ز ہجراں نہ شناسم
رشکم نہ گزد خویشتن از یار نہ دانم
پرسد سبب بے خودی از مہر و من از بیم
درعذر بخوں غلطم و گفتار نہ دانم
بوسم بہ خیالش لب و چوں تازہ کند جور
از سادگیش بے سبب آزار نہ دانم
ہر خوں کہ فشاند مژہ دردل فتدم باز
خود را بہ غمِ دوست زیاں کار نہ دانم
آویزشِ جعد از تہہِ چادر بروم دل
آشفتگیِ طرّہ بہ دستار نہ دانم
بوئے جگرم می دہد از خوں سرِ ہر خار
شد پائے کہ در راہ وے افگار نہ دانم
زخمِ جگرم بخیہ و مرہم نہ پسندم
موجِ گہرم جنبش و رفتار نہ دانم
نقدِ خِردم سکۂ سلطاں نہ پذیرم
جنسِ ہنری گرمیِ بازار نہ دانم
غالب نہ بود کوتہی از دوست ہمانا
زاں ساں دہدم کام کہ بسیار نہ دانم

[1] یہ غزل کلیات غالب فارسی (جلد سوم) مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی مجلس ترقی ادب لاہور کے ص ۳۰۰۔۳۰۱ پر موجود ہے۔

ضمیمہ ۷

حضرت غمگینؒ کے سنینِ ولادت و وفات

حضرت غمگینؒ کی ولادت و وفات کے سنین بوجوہ کافی متنازع امور رہے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے اپنے مضمون میں حضرت غمگینؒ کے چند آثار اور ان کے متعلق چند تذکروں کا حوالہ دیتے ہوئے صحیح فرمایا ہے کہ ''یہ مآخذ سوانح غمگین کے سلسلے میں اہم ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان سے نہ تو تاریخ ولادت معلوم ہوتی ہے اور نہ تاریخ وفات۔ غمگین اکادمی میں جو وظیفے کی کتاب ہے اس میں حافظ میاں عبدالرزاق کے قلم سے حضرت غمگین کی تاریخ ولادت یکم صفر ۱۱۶۷ھ (مطابق ۱۷۵۳ء) اور تاریخ وفات ۳ صفر ۱۲۶۸ (مطابق ۱۸۸۱ء) لکھی ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو سابقہ بیانات کی رو سے ۹۲ کی عمر یعنی ۱۱۹۶ھ (مطابق ۱۷۷۲ء) میں بیعت ہوئے اور ان کی نئی زندگی کا آغاز ساٹھ سال کی عمر یعنی ۱۲۲۷ھ (مطابق ۱۸۱۲ء) میں ہوا'' ان حالات کے پیشِ نظر میں نے مناسب سمجھا کہ ولادت و وفات کے امور پر ایک مختصر سا خاکہ قارئین کے لیے پیش کر دیا جائے۔

۱۔ بہ حوالہ کتاب مطالعہ حضرت غمگینؒ دہلوی مرتبہ محمد یونس خالدی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ۔ ولادت بمقام دلی سنہ ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۸۳ء ص ۹۶

۲۔ بہ حوالہ میر سید علی غمگین (المعروف بہ حضرت جی) مرتبہ نسیم حضرت جی۔ مطبوعہ علمی کتاب گھر کراچی۔ ولادت ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء۔ وفات ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء۔ ص ۵۔ دیباچہ روف پاریکھ۔

۳۔ بہ حوالہ بالا مقالہ بعنوان غمگین شاہ جہان آبادی مصنفہ پروفیسر محمد مسعود احمد۔ ص ۶۶ ولادت ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء۔ بمقام دہلی، وفات گویا یار ۲ صفر المظفر ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۴ء۔

۴۔ بہ حوالہ بالا مقالہ بعنوان غمگیںؔ اور غالبؔ مصنف پروفیسر مسعود احمد ص ۲۴۱

''حضرت غمگیںؔ کے فرزندِ اکبر سید عبدالرزاق، رازقؔ نے سنہ ولادت ۱۱۶۷ھ تحریر کیا ہے مگر خود حضرت غمگیںؔ کے خیال سے ۱۱۹۵ھ مستفاد ہوتا ہے۔ بہ حوالہ شفات اللہ الاسرار قلمی، مقدمہ انڈیا آفس لائبریری ص ۲۴۱۔ مقالہ بعنوان سید علی غمگیںؔ ص ۲۶۷۔ وفات ۱۲۶۷ مطابق ۱۸۵۱ء۔

۵۔ بہ حوالہ کتاب بہ عنوان میر سید علی غمگیںؔ۔ حیات شخصیت اور شاعری مرتبہ ڈاکٹر سید جمیل اختر اسسٹنٹ پروفیسر اردو کملا کالج گوالیار ہندوستان ص ۲۷۔

''والحال کہ عمر بہ شعت سالگی۔ سیدہ وانچہ واردات برمن غالب بودند موافق آنہا دیوان دیگر در حالات و واردات و فرق و شوقِ عشق حقیقی و مجازی خود ترتیب دادم۔'' مکاشفات الاسرار کی ترتیب کے وقت اگر ان کی عمر ساٹھ سال تھی تو ان کا سنہ ولادت ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء متخرج ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت غمگیںؔ کا سنہ ولادت ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء ہی تحقیق ہوتا ہے۔ اب چونکہ ان کی وفات پر جو ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء بمقام گوالیار پر اکثر مصنفین متفق ہیں اور یہی تاریخ وفات ان کے مزار کے کتبہ پر بھی موجود ہے جو تصنیف محمد یونس خالدی میں ص ۷/۰۷ میں موجود ہے اس لئے ان کی ولادت ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء اور وفات ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء ہی متعین ہوتی ہے۔

ضمیمہ ۸

بنام نامی میر سید علی خان بہادر عرف حضرت جی

فرد:

در دل به تمنّایِ قد سبوش نو شورے ست
شوقت چه نمک دادهٔ مذاق ادبم را

جان به جای قند راستان افشاندن نه دل گدازانم. اگر گستاخی نبود، کعبهٔ رهروان را گرد سر گردیدن آرزو کنم. اگر ادب دستوری دهد رسیدن نامه های دلاویز و شنیدن نکته های مهرانگیز که مرا نه خجستگی بخت من امیدواری ستدید، بر من خجسته نماد. چون در آن چشم و دلم جا داده اند، اگر از اوج گرانی سرم به سپهر ساید، جاست و اگر از خودنمائی جز خودم دو نظر نیاید، رواست. طالع یار جان مساعد به شمارهٔ سفینهای آن محیط کرمے که خود از خودم ربوده اند، و ارادت مرا چندانکه به شمار در نگنجد برافزوده. کیستم تا این التماس ارزم و مراد. نکوئی آن پایه نشند که کس مرا نواند ستود و آرزومند دیدن من تواند بود و آنگاه این چنین گرانمایه و والا پایه کسے که گوهرش آبروی بحر دریاست، و گلش رنگ و بوی بهشت گلشن. سخن با آن همه قطع نظر باز به سوی آمده در صومعه به تمنای قدومش چشم به راه و مستور با این همه ترانهٔ انا الحق در بتکده به آوری گنبارش گوش بر آواز. سبحان الله، آنکه تجلی صورت پروانگی شمع جمالش ارزد تا من ارنی گوست، و آنکه دیدارش تاب بر نظر نبود از من دیدار خوست. چه کنم عمرے ست که بهمت من به کارے آویخته و سرگرمی ذوق مطلبے شرر به پیراهنم ریخته است. و آن خود کارے ست نازک و مطلبے سخت دشوار که ازین پیش سالے چند به محکمهٔ ریذیڈنٹی دہلی در کشاکش مانده و روزگارے دراز در انجمن فرمانده بهان کلکته پیچ و تاب خورده. اکنون دو سال است که آن داوری به کشور لندن رفته و در آن دادگاه سنجیده می

میشود۔ تا پاسخِ اران کشور و فرمانے ازان داد گاه در نرسد، نتوانم بر حنبید و ار دہلی بدر رفت۔ اگر خواہم که پارهٔ از حقیقت آن داوری به عرض رسانم، گوینده راسر رشتهٔ سخن از درازی گم شود و شنونده وا گوہرِ راز به کف نیاید۔ بالجمله چشم سرابی و دلم بجائے ست و درین کشمکش که درون و بیرونِ مرا درہم دارد سفر نیارم کرد، اما دانم که روزگارِ انتظار سر آمده و ہنگامِ کشودِ کار در آمده۔ بر آنم و ہمه این می سنجم که چون حکمِ قطعِ خصومت ازولایت رسد، ران پس جز آن مایه مدت که به انجامِ ضروریاتِ سفر وفا تواند کرد، به دہلی نیارامم و روی به گوالیار نہم و اگر روند گان بپا می روند، من بسر پویم۔ امید که به پرورش یافتگاں و زلهٔ ربایانِ مائدهٔ فیضِ حضور فرمان شود که به اوقاتِ خاص مرا و کارِ مرا در خیال آورده خیال آورده ہمّت بدان گمارند که بزودی کارمن سره گردد، و مراد از در درآید، تا پایِ ره پیمایِ من به خرامش کشاد پذیرد و جادهٔ راهِ گوالیار پی سپرِ من گردد۔

نہفته مباد که پس ار رسیدنِ طالع یار خاں صاحب به سه روز منشورے که سراسر رقمِ بحث رنگ و بیرنگی داشت، در ڈاک به من رسیده و ہمت را تعوید بازو گردیده است و ہمچنین امیدوارم که روزے چند پیش از رسیدنِ این عرضداشت سید امانت علی صاحب رسیده اداب نیاز را به موقفِ قبول و غزلہایِ فارسی را به منظرِ التفات رسانده باشند۔ درین نزدیکی میجر صاحب عنایت فرما میجر جان جاکوب صاحب بہادر دو تا نامه به مضمون طالبِ تاریخ تعمیرِ دولت کده به من فرستاده اند۔ ورقے به جوابِ آن ہر دو مکتوب که مشتمل بر قطعهٔ تاریخ است در نوردِ این پوزشنامه فرستاده می شود و چون کشاده عنوانست می توان خواند، و به مکتوب الیه رساند۔ مکرمی مطاعی جنابِ حکیم رضی الدین خان صاحب که مرا به لطف و تفقّد می نوازند و درس غمزدگی شادیِ من به دیدارِ ایشان است، سلامِ نیاز می رسانند و چون من ار دیدار طلبانند۔ زیاده حدِ ادب۔

ضمیمہ ۹

حضرت میر سید علی غمگینؒ کی تصنیفات [1]

۱۔ کلماتِ قدسیہ	عربی
۲۔ ارشاد الحسینی موسوم بہ جواہر تفسیہ	فارسی
۳۔ اسرار الصلوۃ	فارسی
۴۔ المسیح القلوب	فارسی
۵۔ تفسیر آیہ آمن الرسول	فارسی
۶۔ تفسیر چند سورہ ہائے قرآن شریف (تصوف)	فارسی
۷۔ حقیقت الایمان	فارسی
۸۔ حقیقت خلافت	فارسی
۹۔ سر المصحف	فارسی
۱۰۔ کشف الانوار	فارسی
۱۱۔ مراۃ الحقیقت (شرح رباعیات)	فارسی
۱۲۔ مجموعہ مکاتیب (حضرت غمگینؒ و مرزا غالبؔ)	فارسی
۱۳۔ رسالہ اشغال و اذکار	فارسی
۱۴۔ مکاشفات الاسرار (دیوان رباعیات)	اُردو
۱۵۔ مخزن الاسرار (دیوان غزلیات)	اُردو

[1] مندرجہ بالا فہرست مطالعۂ حضرت غمگین دہلوی مرتبہ محمد یونس خالدی مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے ص ۹۶ سے لی گئی۔

ضمیمہ ۱۰[1]

غزل ۱

مرزا غالب

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دل آشفتگاں خال کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

تیرے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کہ اے محو آئنہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سراغ تفِ نالہ، لے داغِ دل سے
کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

حضرت غمگینؔ

دوئی دور کر کے جو ہم دیکھتے ہیں
تو ہے ایک دیر و حرم دیکھتے ہیں

یہ کچھ کفر اٹھا ہے دل میں ہمارے
کہ کعبہ میں بیٹھا صنم دیکھتے ہیں

خدا کے کرم سے سمجھتے ہیں بہتر
صنم تجھ سے جو ہم ستم دیکھتے ہیں

کسی کو نہیں دیکھتے ہم جہاں میں
اسی کو خدا کی قسم دیکھتے ہیں

جنہیں دو گھڑی وصل ہوتا ہے حاصل
وہ اک عمر ہجراں کا غم دیکھتے ہیں

سر انکا دو عالم سے گذرے ہے بارے
جو اک بار میرے قدم دیکھتے ہیں

خدا دشمنوں کو نہ دکھلائے غمگینؔ
جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے

---

[1] مندرجہ ہم طرح غزلیں میر سید علی غمگین دہلوی حیات شخصیت اور شاعری مرتبہ ڈاکٹر سید جمیل اختر اسسٹنٹ پروفیسر آف اردو مہا راجہ گوالیار۔ ہندوستان ص ۲۴۷ تا ۲۵۶ سے لی گئی ہیں۔

غزل 2

مرزا غالب

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا و گرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جانگداز کا

ہیں بسکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

تاراج کاوش غم ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

حضرت غمگینؒ

شکوہ کروں میں کس لئے عمر دراز کا
چسکا ہے آج تک مجھے عشق مجاز کا

کیا قہر ہے کہ ہم کو رہا ہی نہیں تمیز
ہے اور یہ مقام بہت امتیاز کا

جاں تک نثار کرنے کو حاضر ہے ہمدمو
مفتوں یہ دل ہے اس کے کچھ انداز و ناز کا

اس ساز دل سے نکلے ہے ہر نالہ سوزناک
محتاج میں نہیں ہوں کسی سوز و ساز کا

پھر تجھ کو لطف عشق رہے گا تو یاد رکھ
پرساں نہ ہو دلا تو مرے اس کے راز کا

وہ صرف ناز اور سراپا ہوں میں نیاز
کچھ مرتبہ رہا نہیں رازو نیاز کا

مجھ کو تمیز ہے نہ پلا ساقیا شراب
عالم ہے اور وقت نہیں امتیاز کا

غمگینؔ بدل کے قافیہ لکھ اور اک غزل
کر ذکر اس کے اپنے مگر اس میں راز کا

غزل 3

حضرت غمگینؒ	مرزا غالب
کل شب کو خود بخود یہ مجھے اضطرار تھا	ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
بیٹھے نہ چین آہ نہ لیٹے قرار تھا	خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
ہمدم نہ پوچھ وصل کی کچھ تو تمام رات	اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہر آرزو
وہ شرمسار اور میں بے اختیار تھا	توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
ہوش اس کو کچھ نشے میں نہ تھا شب کو میکشو	گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
محفل میں اپنی جو کہ بہت ہوشیار تھا	جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا
مت پوچھ بیکسی کی غم ہجر میں ترے	موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
میرا بجز فنا نہ کوئی غمگسار تھا	ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا
زاہد سے جو کہ تو نے کیا عذرِ میکشی	کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
غمگیں نہ خالی کبر سے وہ انکسار تھا	دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

غزل 4

مرزا غالب

حسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی بھی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

حضرت غمگینؔ

کچھ نہ کچھ بھید مرا اس پہ کھلا میرے بعد
کہ کھلے رکھنے لگا بند قبا میرے بعد

سب ہوئے سست وفا ظلم سے عاشق اسکے
سخت آوارہ ہوئے مہر و وفا میرے بعد

اپنے مرنے سے میں خوش ہوں مگر اتنا غم ہے
کس پہ اس طرح سے ہوگا تو خفا میرے بعد

بعد مجنوں کے رکھا دشت کو میں نے آباد
ایسے ویرانے میں کون آ کے رہا میرے بعد

بزم سے اٹھ کے میں بیٹھا پس دیوار رہا
ذکر بھی میرا کسی نے نہ کیا میرے بعد

ہے مگر مجھ سے ہی عالم کو بقا اے غمگیںؔ
کہ یہ آخر ہے یقیں جان فنا میرے بعد

غزل 5

مرزا غالب

نے گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائش خم کا کل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

لافِ تمکینِ فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں وہ میرے قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سربسر انداز

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

حضرت غمگینؒ

نہ مغنّی ہوں میں نہ مطرب ساز
ہے یہ در پردہ اور کی آواز

محورکھ دل شراب و شاہد میں
بابِ توبہ ہے تاقیامت باز

دست قسمت ہی ہے مرا کوتاہ
ہاتھ کیونکر وہ آئے زلفِ دراز

کیوں نہ ہر دم ہو مجھ کو موت' حیات
وہ تو جاں بخش اور میں جانباز

آسمان و زمین کا اے دل
گر برابر ہو یہ نشیب و فراز

جبکہ وہ جائے گی یہ رہ ہموار
کشف منزل کے ہونگے تب سب راز

جب کہا اس نے مجھ سے کون ہے تو
عرض کی میں نے تب بہ عجز و نیاز

در پہ چندے سے آپ کے ہوں مقیم
اک مسافر ہوں میں غریب نواز

نہ تو میں پارسا ہوں اے غمگیںؒ
نہ نمازی نہ رندِ شاہد باز

غزل 6

مرزا غالب

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک ہے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

حضرت غمگینؒ

ہر ہر قدم کو رکھ دل سرشار دیکھ کر
گمرہ نہ لوگ ہوں تری رفتار دیکھ کر

کل بزمِ میکشی میں اس المست نے شراب
کیا کیا مجھے پلائی ہے ہشیار دیکھ کر

کیا کیا ترا ہنسے ہے وہ بیمارِ ہجر آہ
روتے ہیں جوں جوں اس کو پرستار دیکھ کر

تھا جی میں خوب دل کی نکالیں گے ہم بھڑاس
پر چپ سے ہو رہے تری گفتار دیکھ کر

ممکن نہ تھا کہ شکوہ وہ رہتا یہاں مگر
ناچار رہ گیا مجھے ناچار دیکھ کر

اے وائے شوق دیکھوں ہوں جوں جوں کہ تجھ کو یار
بڑھتی ہے اور حسرتِ دیدار دیکھ کر

صیاد نے بھی دام سے آخر رہا کیا
اپنا بس آپ مجھ کو گرفتار دیکھ کر

غمگیںؔ میں رشک رنج سے بیمار ہو گیا
غیروں کو اس کا درپے آزار دیکھ کر

غزل 7

مرزا غالب

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تمکو خبر ہونے تک

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

حضرت غمگینؒ

کون جیتا ہے شب ہجر سحر ہونے تک
عمر اک چاہئے یہ عمر بسر ہونے تک

خانہ آباد کہیں دیکھ نہ ہو گھر برباد
دل میں اس بت کے وفا کا ترے گھر ہونے تک

مثل شبنم نہیں کچھ ہستی موہوم اپنی
کہ ترے مہر کی ٹھیرے یہ نظر ہونے تک

خون نہ ہوا اے دلِ بیتاب میں قربان تیرے
صدف چشم میں اشکوں کے گہر ہونے تک

آئے بھی اور گئے دل بھی وہ لے کر غمگین
ہائے کیا کیا نہ ہوا ہم کو خبر ہونے تک

غزل 8

مرزا غالب

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

حضرت غمگینؒ

کیا حسن ہے وہ آہ وہ کیا جمال ہے
دیکھا تو خیرہ خیرہ نگاہ خیال ہے

مردہ کو زندہ' زندہ کو مردہ کرے ہے تو
اے فتنہ زیر پا تری اعجاز چال ہے

مجھ کو نہ کر مقید زنجیر زلف یار
تقصیر واژگوں کہ مرا بال بال ہے

کرتا عبث ہے منع شراب و سماع کو
زاہد تجھے حرام ہے ہم کو حلال ہے

ہمدم خیال اس کے نہ رکھ وصل وہجر کا
جس کا وصال ہجر ہے' ہجراں وصال ہے

خاطر میں گرمری تو غزل اور ایک لکھ
غمگیں ترا جو حال ہے بس وہ ہی قال ہے

غزل 9

مرزا غالب

چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مئے اپنے کو کھینچا چاہئے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہئے

چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہئے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہئے

حضرت غمگینؒ

صرف مجھ کو عشق تیرا چاہئے
عشق تیرا ہے تو پھر کیا چاہئے

یہ بہانہ نیک ہے پی کر شراب
آج اس کو خوب چھیڑا چاہئے

جس کے بن دیکھے ہے یہ حالت مری
دیکھئے تو کیا ہو دیکھا چاہئے

وہ بلاوے گا جنازہ پر تمہیں
زندگی جس کو دوبارہ چاہئے

یار بے پردہ ہے روز و شب مگر
دیکھنے کو چشم بینا چاہئے

جو نہ سمجھے اسکو سمجھاتا ہے تو
ناصحا اتنا تو سمجھا چاہئے

اصل نام مختار علی خان ہے۔ روہیل کھنڈ (یو۔پی، انڈیا) میں ایک پٹھان زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بریلی اور رامپور میں ہوئی۔ 1950 میں اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئے۔ اپنے بڑے بھائی کی ملازمت کے سبب بنوں (خیبر پختونخوا) میں بود و باش اختیار کی۔ پشاور یونیورسٹی سے بی۔اے (آنرز فارسی) ایم۔اے (فارسی) اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ پشاور یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ ہیں۔ ایم۔اے فارسی میں یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے پر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۵۷ء میں اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان میں کامیاب ہوکر پاکستان ٹیکسیشن سروس میں شامل ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں خان آف ٹوپی ضلع صوابی (خیبر پختونخوا) کے معروف خانوادہ میں شادی کی۔ سنٹرل (حالیہ فیڈرل) بورڈ آف ریونیو سے بحیثیت ممبر ریٹائر ہوئے اور پھر وزیراعظم معائنہ کمیشن (حالیہ این۔اے۔بی) میں بھی بطور ممبر دو سال کام کیا۔ اب اسلام آباد میں قیام پذیر ہیں۔

ہندوستان میں روہیل کھنڈ کی ایک تاریخی پٹھان ریاست کے بانی حافظ الملک حافظ رحمت خان سے نسبی تعلق کے سبب اپنے نام کے ساتھ لڑکپن ہی سے روہیلہ بھی لکھتے تھے سو ادبی نام پرتو روہیلہ ٹھہرا۔ ۱۹۸۲ء میں ان کو ان کی پشتو تالیف ''چپے'' پر پاکستان رائٹرز گلڈ کا بہترین علاقائی ادب کا پہلا انعام ملا۔ ۱۹۸۶ء میں ان کے اردو شعری مجموعے ''نوائے شب'' کو اکیڈمی ادبیات اسلام آباد کا ہجرہ ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں وہ صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی کے مستحق قرار پائے۔ ۲۰۰۹ء میں ان کو ان کے شاہکار ''کلیاتِ مکتوباتِ فارسی، غالب'' پر، جو غالب کے تمام متداولہ فارسی مکتوبات کا ایک دلآویز ترجمہ ہے، ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا اور پھر ۲۰۱۰ء میں اکیڈمی ادبیات اسلام آباد کی جانب سے اس تالیف کو سال کے بہترین اردو ترجمہ کا ایوارڈ عطا ہوا۔ ان کی نثر اور نظم کے سات مجموعے ہیں، نثر میں ان کا امریکہ کا ایک سفرنامہ بھی ہے۔ وہ نثر ہو یا نظم ان کی ہر تخلیقی کاوش میں زبان و بیان کے ساتھ اندیشہ و فکر کی غیر معمولی انفرادیت و یگانگی پائی جاتی ہے۔

سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے غالب کے فارسی مکتوبات کے تراجم پر توجہ دی اور گیارہ بارہ سال کی محنت اور عرق ریزی کے بعد غالب کے تمام متداول فارسی مکتوبات کا دلآویز اردو میں ترجمہ کر دیا۔ غالب کے مشکل اردو اشعار کی ایک منفرد شرح ان کی غالب شناسی کا ایک اور وقیع کام ہے۔ غالب پر لکھے گئے چند اہم مقالات ادارۂ انجمن ترقی اردو کراچی میں زیر طبع ہیں۔ اور اب زیر نظر کتاب۔ اس کی بڑی فضیلت تو یہی ہے کہ غالب اور حضرت غمگینؔ کے نو دریافت فارسی مکتوبات کے اردو ترجمے پر مبنی ایک انتہائی دلچسپ و مربوط مکالمہ ہے۔ اور اب اس مکالمے کی اہمیت اس وجہ سے بھی دو چند ہوگئی ہے کہ غالب کے فکر و عقائد کے کئی گوشے جو تاحال چنداں روشن نہیں تھے کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ چنانچہ بحیثیت مجموعی یہ تالیف غالب شناسی کے باب میں ہمارے دورِ پُرآشوب کا ایک اہم اضافہ ہے۔ (ادارہ)

National Language Authority, Pakistan